محمد حبیب الرحمٰن

کاروانِ حسرت

حسرت شروانی

باسمہ سبحانہ

تقریب و تذکرہ

(از خامہ مولانا محمد عبدالشاہد خان شروانی)

انقلاب ۱۸۵۷ء نے دوسری چیزوں کی مانند ہندوستان کی ادبی زندگی پر بھی اپنا پورا اثر ڈالا۔ دوسرے اساتذۂ وقت کی طرح غالب جیسے یگانہ روزگار فاضل کی شاعری بھی اس حادثہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ انکی شاعری کے دونوں دوروں پر نظر ڈال جائیے۔ آپکو خود اندازہ ہو جائیگا کہ قنوطیت و مایوسی کہاں ہے اور امید و حوصلہ کہاں!

بالکل اسی طرح جیسے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں پر ایک خاص قسم کا خوف و ہراس اور سراسیمگی و پژمردگی چھا گئی ہے اور انکی زندگی کا ہر شعبہ چند ماہ کے قلیل عرصے میں اس اچانک انقلاب سے متاثر ہے، ستمبر ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اس بہادر لیکن عیش و عشرت میں پڑ جانیوالی قوم کا یہی حال ہو چکا تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالی کا مسدس قوم کا صحیح نقشہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ہمارے شعراء، شاہزادگان و امراء قلعہ معلی کی مجالس کی پہلے ہی سے رونق بنے ہوئے تھے عیش و عشرت کی گودوں میں پلنے والے شاہزادے دنیا و مافیہا سے بیخبر، گل و بلبل، پیمانہ و مُل، اور ناقہ و لیلی کی قافیہ پیمائی میں اپنا وقت گذار رہے تھے۔ گرد و پیش حاضر رہنے والے شاعروں کے سامنے یہی ایک موضوعِ سخن رہ گیا تھا۔ انقلاب ۵۷ء کے بعد قنوطیت نے بھی جگہ لے لی۔ اب شعراء کے دو ہی مقصدِ زندگی رہ گئے تھے یا تو حالی کی طرح قوم کی بے کسی، بداعمالی، اور افسردگی کا رونا روتے رہیں یا بادہ و ساغر، شمع و پروانہ، گل و بلبل، طور و موسی، اور قیس و لیلی کی حکایتوں میں اپنا جی بہلائیں، اور شیخ و واعظ کی پگڑی اچھال کر لذیذ اطعمہ میں "تخمیص" کا موقعہ بہم پہنچائیں۔ دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا اتباع دوسرے مکاتب کر رہے تھے اور امیر و داغ کی شاعری کا ہندوستان میں ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا۔

کاروان حسرت کا ابتدائی دورِ زندگی اسی ماحول میں گذرا۔ انقلاب ۵۷ء کے چند سالوں کے بعد ہی آپکی پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو نسبی طور پر سپاہی تھا اور حسبی لحاظ سے تموّل و حکمرانی کی گود میں صدیوں سے پرورش پا رہا تھا ظاہر ہے کہ ان تمام چیزوں کا اثر طبیعت پر پڑنا ہی چاہیئے تھا۔ چنانچہ ہم آپکی شاعری میں بھی وہ تمام چیزیں پاتے ہیں۔ جو اس دور کے دوسرے شعراء کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے چند اشعار ۱۳۰۳ھ میں، نیم ندی کے طوفان سے متاثر ہو کر ۲۰ سال کی عمر میں موزوں کئے جن کو آج ۶۴ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ ان اشعار سے جہاں شاعر کی معصومیت کا پتہ چلتا ہے وہیں اس دور کی زبان کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ہم بیکسوں سے بغض فلک کو ہے کس قدر
اک تھی نمود قبر اُسے بھی مٹا دیا

عبرتکدہ مزارِ رئیسوں کا ایک تھا — کیا جانئے فلک نے اسے کیوں بہا دیا
تھے آرمیدہ اس میں بیسانِ نیکذات — حاتم کو جن کی بذل نے دل سے بھلا دیا
داؤد خاں و خانِ زماں خانِ باصفا — کسریٰ کو جن کے عدل نے گویا جلا دیا
دُنیا کے عیش چھوڑ کے سوئے تھے قبر میں — اے چرخ تونے ان کو وہاں بھی جگا دیا

اِسی سال کا یہ شعر بھی اُسی دور کی زبان کی یاد دلاتا ہے۔

یاد تھی دل میں تری آہ لبوں پر جاری — لطف کیا باغ میں جا بے تری میں نے پایا

دو ایک شعر اور بھی اسی دورِ زبان کی یادگار نظر پڑے

پوچھے ہے حالِ زار مرا دیکھ وہ صنم — ہو کس جفا سرشت کے پالے پڑی ہوئے
ہائے داغ تیرے دل کی حسرتیں نکلیں نہ کچھ — میرے ہمدم قبر میں مجھکو لٹا کہنے لگے

تخلص ابتداء میں عذرائے سخن کی فریفتگی نے دامنؔ تخلص رکھا دیا تھا، فریفتگی کے لئے حسرت و ارمان کا ہونا بھی ضروری ہے اس لئے اس راہ میں پختہ کاری کے بعد حسرتؔ تخلص رکھا۔

یہ کچھ اشعار ابتدائی دورِ شاعری کے نقل کئے گئے تاکہ بہ تدریج ترقی کا اندازہ ہو سکے۔ البتہ ایک شعر اسی سنہ ۱۳۰۳ھ کا قابلِ داد ہے جو بار بار پڑھنے سے بھی لطف میں کمی نہیں ہونے دیتا۔

ہم پائمالِ ہجر، عدو کامیابِ وصل — اے چرخِ دوں نواز، ستم کی ہو انتہا

شوخی حسرتؔ بھی دوسرے شعراء کی طرح اس زمانے کی روش پر چلے اور گو اس دور میں اِس قسم کی شوخی نازیبا معلوم ہوتی ہو لیکن اُس وقت کا بڑے سے بڑا متین اور زاہد خشک شاعر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ شوخی ملاحظہ ہو۔

اشارہ صاف کرتی ہو کسی سینے کی متوونی — کہ جنسِ حسن، قدرت نے اسی کانٹے میں تولی ہو
حصولِ مدعا اب کوئی دن کی بات ہے حسرتؔ — نگاہیں مل چکی ہیں، گفتگو مطلب کی ہولی ہو

وصل کی شب ہائے وہ کہنا ترا — مجھکو حسرتؔ تونے رسوا کر دیا

چومتا ہوں خود اپنے لب حسرتؔ — کس کے بوسے کا ہے اثر باقی — سنہ ۱۳۰۷ھ

حسرتیں دل کی نکل جائیں فراتوائے کاش — ایک ہی رات کو مل بیٹھتے ہم تم باہم — سنہ ۱۳۰۶ھ

شب کو کنارِ غیر میں سویا کئے جو آپ — میں خواب ہی میں آپ کے بوسے لیا گیا — سنہ ۱۳۰۳ھ

مرگیا میں اب تو ہٹ پوری ہوئی — لو مری جاں اب تو کہنا ہو گیا

قنوطیت جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر عام طور سے خوف و ہراس، اور مایوسی و اضطراب چھا گیا تھا اس کا اثر شعراء کے کلام پر بھی پڑا۔ حسرتؔ شہردانی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

کچھ نہ دیکھی ہم نے تاثیرِ فغاں　　روتے روتے اک زمانہ ہوگیا سنہ ۱۳۰۵ھ

گئے وہ دن کہ اپنا آشیاں تھا صحنِ گلشن میں　　قفس سے جھانک لیتے ہیں کبھی اب تو بیاباں کو

کدھر ہیں کیانی و رومی و مغلی　　جہاں سے اُٹھے خانداں کیسے کیسے سنہ ۱۳۰۶ھ

تھا کبھی اوج پہ تو جاہ و جلالِ مسلم　　ہے زبانوں پہ فقط اب تو حکایت تیری

کبھی کبھی قوم کو ناصحانہ انداز میں اُبھارنے کی بھی کوشش کی ہے۔

قدموں پہ شاہِ دیں کے جب ہوگا سر ہمارا　　تب اوج پر ہمارا جاہ و جلال ہوگا

غیروں کی کجکلاہی باقی رہے گی کب تک　　ابرو کے بل کی کنجی اپنا ہلال ہوگا

سر پہ ہیں جو بلائیں آئیں گی زیر پا بھی　　جس کو کمال ہوگا، اُس کو زوال ہوگا

ہے آج تم کو فرصت کچھ کام کر دکھاؤ　　اوروں کے ہاتھ میں کل یہ ماہ و سال ہوگا

تقویم سال نو میں ہو کاش وہ گھڑی بھی　　حسرت زدوں کو حاصل جس میں وصال ہوگا

ندرتِ خیال و شگفتگیٔ زبان اب ایسے چند اشعار بھی ملاحظہ کیجیے جن میں زبان، ندرتِ خیال، روانی، اور شگفتگی کا پورا پورا مظاہرہ ہے۔ ان میں سے بعض اشعار پر تو سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔

آئنہ، پیکرِ تصویر، نگاہِ مشتاق　　جسے دیکھا تری محفل میں وہ حیراں نکلا

حسرت و یاس کا انبوہ، فغاں کی کثرت　　میں تری بزم سے کیا باسر و ساماں نکلا

حسنِ روز افزوں کی جلوہ ہیں غضب کے دلربا　　کس طرح ہر روز حسرت دل نیا پیدا کروں

وادیٔ عشق! تیری خار پہ سو گل قرباں　　اُنس سے بڑھ کے مزا دیتی ہے وحشت تیری

حیا، ناز، پندار، رعب و تغافل　　تمھارے بھی ہیں پاسباں کیسے کیسے

ہر گراں جاں کو ہے شوقِ جنسِ درد　　کس قدر سستا یہ سودا ہوگیا

دل سے رخصت ہوں سب تمنائیں　　وہ سراپا حجاب یاد آیا

پھر کسی کی گلی کو جاتا ہوں　　دل خانہ خراب یاد آیا

گھومتا ہے جوشِ وحشت میں مثالِ چرخ پیر　　تیرے در پہ جا کے دم لیتا جو ہوتے سر کے پاؤں

میری آنکھوں میں یہ پھرتا ہے جہاں جاتا ہوں میں　　مجھ کو حیرت ہے کہاں سے آئے تیرے گھر کے پاؤں

قدم تیرا تو دم میرا، یہی آباد رکھتے ہیں　　شبستاں کو، بیاباں کو، چمن کو، بیتِ احزاں کو

ایک ہی کا حسن ہے جلوہ نما کونین میں　　دوسرا تو جب کہوں جب دو سرا پیدا کروں

حسرتؔ نے غزل کے علاوہ دوسرے اصنافِ سخن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ حسرت نامہ، چاندنی رات، برسات، اور تصویرِ عبرت، چار نظمیں بھی زیبِ دیوان ہیں بعض قطعات بھی لکھے جو مصلحتاً خارج کر دیئے گئے تصنیف و تالیف، مطالعۂ کتب، اور تنظیم امورِ ریاست نے شاعری کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہونے دیا۔ مدۃ العمر کا حاصل یہ تین جزر کا مختصر دیوانِ اُردو ہے اور تقریباً اتنا ہی دیوانِ فارسی ہوگا جو اس کے بعد حلّۂ طبع سے آراستہ ہوکر جلد شائقینِ ادب کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ حسرتؔ کی شاعری "تحمیض" کے بطور رہی جس طرح مختلف کھانوں کے ساتھ چٹنی لطف کا سامان مہیا کر دیتی ہے اسی طرح حسرتؔ کی شاعری ہجومِ افکار اور کثرتِ کار کی سرگرانی کو دور کرنے والی رہی۔ لیکن جو کچھ کہا ہے وہ فنی اسقام، اور حشو و زوائد سے پاک و صاف ہے۔ بہت کہتے اور رطب و یابس سے دیوان کا ضخم بڑھا دیتے۔ اس سے یہ کہیں بہتر ہوا کہ کم کہا لیکن جچا تلا کہا۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مرتب کو انتخاب کرنے کی زحمت سے نجات مل گئی۔ اب یہ دیوان بلند حوصلہ جوہری کی ایسی دکان ہے جس میں کوئی کم قیمت اور ناقص موتی نہیں ہے بلکہ بیش بہا لعل و جواہر کی چمک دمک شاہ و جوہری دونوں کو قدر دانی پر مجبور کر رہی ہے۔

کسی فاضل کا مقولہ "الشعر آخر العلوم" اہلِ فن میں مشہور ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر حسرتؔ کے اشعار پر نظر کی جائے تو اس کا صحیح مصداق ثابت ہوں گے۔ ہندوستان کی یکصد سالہ مسلسل غلامی نے اس مقولہ کو "الشعر اول الجہل" میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہر جاہل شاعر بن چکا تھا بلکہ ہمہ دانی کے اصرار نے نہ صرف مطلق جہل بلکہ جہلِ مرکب میں اسے مبتلا کر دیا تھا۔ غلاموں کے لئے بیکاری کا مشغلہ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا کہ غلامی کی زنجیریں کاٹنے کی جدوجہد کے بجائے فضول شعر گوئی میں وقتِ عزیز گذارا جائے۔ اسی لئے ہر بوالہوس کے شعر پرستی شعار بنا لینے کی وجہ سے "آبروئے شیوۂ اہلِ نظر" پر نگاہ رکھتے ہوئے آزادؔ و حسرتؔ جیسے افاضل اس "جنس ارزاں مایہ" سے کنارہ کش ہو کر اس وادی سے علٰحدہ ہٹ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادؔ کا اتنا سرمایہ بھی ہمیں نہیں مل سکتا جتنا حسرتؔ کا ذخیرہ مل گیا ہے۔ اور حسرتؔ کا ۴۶ سال کا ذخیرہ بھی ۴۶ صفحات کو پُر نہ کر سکا ہے۔

حسرتؔ نے ذوقِ شاعری کی تکمیل استادِ وقت منشی امیر احمد مینائی سے کی۔ مرحوم کی وفات کے بعد موصوف کے جانشین جناب جلیل استادِ سلطان دکن، اور علامہ شبلی نعمانی سے دادِ سخن لیتے رہے۔

حسرتؔ کے اشعار کا دوسرے مشاہیر کے اشعار سے موازنہ بھی کیا جا سکتا ہے اور بعض اشعار پر بہت کچھ لکھا بھی جا سکتا ہے مگر اس کام کو کسی دوسرے صاحبِ نظر، اور ماہرِ ادب کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ملک کے سامنے یہ حدیقۂ اشعار پہنچے گا تو کوئی نہ کوئی گلچینِ بہار، دامن بھرنے کی کوشش ہی کرے گا۔ پھر اس مختصر مقدمہ میں اتنی گنجائش کہاں نکل سکتی تھی کہ رخشِ قلم کو جولانی کا موقعہ دیا جاتا۔

ہم نے حسرت کے چند اشعار ایسے بھی نقل کر دیئے ہیں جو گذشتہ دورِ سخن کی یاد دلاتے ہوئے شوخی کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں۔ اب حسرت کا کیا مذاق ہے یہ مضمون "اردو غزل" کے آخری دو ٹکڑوں میں ملاحظہ کر لیجئے۔ یہ مضمون جو ہم شامل دیوان کر رہے ہیں رسالہ اردوئے معلی کانپور میں (جلد ۳ نمبر ۲ ماہ اگست ۱۹۰۳ء) شائع ہو چکا ہے جسے ۴۴ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ حسرت اپنے بتائے ہوئے اصول پر کہاں تک کاربند رہے ہیں اس کا پتہ غزلوں پر پڑے ہوئے سن و سال سے چل سکے گا۔ یہ مضمون کس قدر جامعیت سے لکھا گیا ہے اور کتنے ادوارِ ماضیہ پر اختصار کے ساتھ اس میں تبصرہ ہو گیا ہے اس کی داد فن داں حضرات ہی دے سکتے ہیں۔

اب سے دو سال قبل ینگ شروانیز کلب علیگڈھ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۹ نومبر ۱۹۴۵ء میں میں نے مجلس انتظامیہ کی استدعا و اصرار پر "نواب صدر یار جنگ بہادر" پر ایک مقالہ پڑھا تھا جو مجلہ مصنف علیگڈھ (جنوری ۱۹۴۶ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ میں نے کلام حسرت کے متعلق اس میں یہ اظہار خیال کیا تھا۔

"اردو فارسی کا علیحدہ علیحدہ ذخیرہ کلام دیوان کی ترتیب پر حبیب گنج کتب خانہ میں موجود ہے، خدا کرے یہ ادبی جواہر پارے اشاعت پذیر ہو کر جلد از جلد ادبی لٹریچر میں قیمتی اضافہ کریں۔ موتی صدف سے نکل کر ہی قیمت و شہرت حاصل کرتا ہے، موتی صدف میں بھی موتی ہی رہتا ہے مگر نہ تو اپنی آب و تاب سے دنیا کو جگمگا سکتا ہے نہ دنیا اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتی ہے۔"

خدا کا شکر ہے کہ زیادہ عرصہ نہیں گذرنے پایا کہ یہ آرزو پوری ہوئی اور "کاروانِ حسرت" نے منزلِ اشاعت پر آکر دم لیا۔

حسنِ اتفاق امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا سنِ ولادت ۱۳۰۵ھ ہے، اور "زنبیلِ خیال" کی پہلی غزل بھی ۱۳۰۵ھ ہی کی لکھی ہوئی ہے کسے خبر تھی کہ ان دونوں نومولودوں میں کوئی رشتہ انس بھی نکل آئے گا اور پورے ساٹھ سال کے بعد صاحبِ اولادِ معنوی (اشعار) "کاروانِ خیال" اور "غبارِ خاطر" کا "صدیق مکرم" ہوگا۔

ولادت و تعلیم حسرت شروانی، ۲۸ شعبان المعظم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء و ۱۲۷۴ف کو اپنے آبائی قلعہ بھیکن پور، ضلع علیگڈھ میں بوقت صبح کتمِ عدم سے عالمِ شہود میں آئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کو صرف ۹ سال گذرے تھے، مسلمانوں پر عام طور سے جمود و مایوسی طاری تھی، آپ نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی، عقیقہ ہوا تو محمد حبیب الرحمن خاں نام رکھا گیا۔ ہوش سنبھالا تو خاندانی رواج کے مطابق مولوی سید حسن شاہ[1] رامپوری نے رسم بسم اللہ ادا کرائی،

---

[1] موصوف کا ذکر تذکرہ کاملانِ رامپور، مؤلفہ حافظ احمد علی خاں شوق اور انتخاب یادگار مؤلفہ منشی امیر احمد مینائی میں بھی موجود ہے ۱۲

چند دن کے بعد جب صرف پارہ عم پڑھا کر آپ اپنے وطن چلے گئے تو میر فرزند علی مارہروی نے قرآن شریف ختم کرایا، خط کی مشق کرائی، اور بہار دانش تک فارسی پڑھائی۔ سہ نثر ظہوری تک میر صاحب کے بعد حکیم سلیم اللہ ساکن محلہ بنی اسرائیل کول (علیگڈھ) نے پڑھایا۔ مولوی سید اکبر صاحبؒ نے عربی کا آغاز کرایا۔ مولوی صاحب کی صحت اچھی نہ تھی اس لئے تعلیم کم ہو سکی، اور صرف کے فارسی رسالے صرف میر، زبدہ تک پڑھا سکے۔ آپ کے بعد مولوی غلام محمد پنجابی تلمیذ مولانا لطف اللہؒ کا تقرر ہوا۔ نحو میں دستگاہِ تام رکھتے تھے آپ نے شرح جامی تک نحو، شرح تہذیب اور بدیع المیزان تک منطق، مالا بدمنہ، منیۃ المصلی، قدوری، اور کنز الدقائق فقہ میں پڑھائیں شرح جامی کی تعلیم میں پورا اہتمام کیا تھا۔ ایک بار رامپور سے ایک مولوی صاحب آئے جو شرح جامی کے اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ آپ کے عم محترم مولوی محمد عبد الشکور خاں نے ان کو مکتب میں بھتیجے کا امتحان لینے کے لئے بھیجا۔ انھوں نے "حاصل محصول" کی بحث میں امتحان لیا واپس جا کر کہا "لڑکا سمجھتا ہے" مولوی غلام محمد صاحب کے بعد مولانا عبد الغنی خاں[1] شاگردِ رشید استاذ العلماء مولانا محمد لطف اللہؒ نے قطبی، میر قطبی، مختصر المعانی، ہدیہ سعیدیہ پورے اہتمام و کاوش سے پڑھائیں۔ مطالعہ کی سختی سے تاکید اور ترک مطالعہ پر تنبیہ ہوتی۔ فقہ میں ہدایہ اخیرین کتاب الرہن تک، منطق ملا حسن تک، اصول فقہ میں نور الانوار اور توضیح تلویح مقدمات اربعہ تک، حدیث میں مشکوۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین، بیضاوی (سورۂ بقرہ) تک پڑھائیں۔ ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی ہوتی رہی ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ پہنچ کر استاذ العلماء مولانا محمد لطف اللہ لکھنوی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حمد اللہ، قاضی مبارک میر زاہد رسالہ (مع غلام یحییٰ) مولانا سے پڑھا۔ شمائلِ ترمذی، ساڑھے نو پارے صحیح بخاری کے شیخ حسین عرب بھوپالی سے پڑھے۔ باقی روایات کی سند عطا ہوئی۔ حدیث "المتحابان فی اللہ" الخ کی روایت حضرت پیر مرشد مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی قدس سرہٗ نے (جو موصوف کو شاہ عبد العزیز صاحب سے پہنچی تھی) عطا فرمائی۔ چہل حدیث شاہ ولی اللہ صاحب کی قاری عبد الرحمٰن صاحب پانی پتی (تلمیذ شاہ اسحاق صاحب مرحوم) سے پڑھی۔ باقی روایات کی سند دی گئی۔ مکہ مکرمہ میں قاری سید عبد الرحیم صاحب کو (جو معمر اور قراء کے دورِ سابق کی یادگار تھے) کلام مجید پورا سنایا۔ مدینہ طیبہ میں قاری حسن شاعر سے ان کا رسالۂ قرأت پڑھا، اخیر سبق مسجد نبوی میں پڑھایا اور سند قرأت عطا فرمائی۔ شیخ حبیب اللہ الشنقیطی سے حدیث "مصافحہ" و "مشابکہ" نیز دیگر مرویات کی سند حرم شریف میں حاصل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ حرمین شریفین میں اس سعادت عظمیٰ سے ۱۳۴۴ھ میں سرفرازی کا موقعہ ملا جبکہ حیدر آباد

---

[1] کالو خاں ضلع پشاور کے باشندے اور سادات ترمذی سے تھے، مولانا محمد لطف اللہ لکھنوی کے شاگرد تھے، حدیث مولانا احمد علی سہارنپوری سے پڑھی تھی، ولایتی ہونے کے باوجود اردو صاف بولتے تھے اسی وجہ سے محدث سہارنپوری کے درس میں قرأت بھی کر لیتے تھے حالانکہ دوسرے ولایتی طلباء کو زبان صاف نہ ہونے کی وجہ سے اجازت نہیں ملتی تھی۔ ۱۲۰

سے عہدۂ صدر الصدوری سے سبکدوشی کے بعد حج و زیارت کے لئے احباب و اعزا کو لے کر حجاز مقدس جانا ہوا۔ مولوی غلام محمد پنجابی کے تعلیم عربی کے زمانے میں ماسٹر عبدالرشید خاں ساکن علی گڑھ تعلیم یافتہ محمڈن کالج سے انگریزی شروع کی جو ۱۸۸۵ء تک جاری رہی ۱۸۸۶ء میں باقاعدہ آگرہ کالج کے ہائی اسکول میں درجہ ہشتم میں داخلہ ہوا۔ ۱۸۸۸ء تک تعلیم جاری رہی، تعلیم اسکول کے علاوہ مسٹر ورنن ہیڈ ماسٹر اور مسٹر کاکی سکنڈ ماسٹر سے انگریزی ادب حاصل کیا۔ آگرہ سے علیگڈھ آ کر مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر محمڈن کالج ہائی اسکول اور مسٹر کیسے بن ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علیگڈھ سے ادب پڑھنے اور لکھنے کی مشق کی، چونکہ تعلیم عربی پر پوری توجہ مرکوز رہی اس وجہ سے انگریزی میں زیادہ ترقی نہ ہو سکی۔ سیاق (طریقہ حساب کاغذات ریاست) حبیب اللہ خاں ساکن بھیکن پور[*] وحبیب گنج سے سیکھا جو اس فن کے ماہر تھے۔

خاندان حسرت خاندان شروانی کے چشم و چراغ ہیں جو لودھی اور غلزئی کے بھائی شروانی کی اولاد میں ہیں۔ سلطان بہلول لودھی کے وزیر اعظم عمر خاں شروانی جن کا خطاب مسند عظم تھا مورث اعلیٰ ہیں، عمر خاں شروانی کے خاندان میں کئی پشت تک سلاطین لودھیہ کی وزارتِ عظمیٰ قایم رہی۔ ان کے لڑکے محمد خاں شروانی نے ۱۵۲۵ء میں ابراہیم لودھی کے زمانے میں علی گڑھ کا مشہور مضبوط ترین قلعہ تعمیر کرایا جو اب مٹ کر محلہ بالائے قلعہ کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کا نام محمد گڑھ رکھا تھا۔ شیر شاہ سوری کے عہد میں شروانیوں کا اقتدار رہا، شیر شاہ کے ہندوستان کی سلطنت پر قبضہ اور ہمایوں بادشاہ کے اخراج سے مغل سلاطین پٹھانوں کے مخالف ہوئے اور فوج سے خارج کر کے انکو آوارہ کر دیا، اکبر بادشاہ اور شاہجہاں کے عہد میں پٹھان دہلی سے نواح علی گڑھ میں آئے اور زمینداریاں قایم کیں۔ حسرت کے پردادا محمد باز خاں شروانی بڑے نامور بزرگ گذرے ہیں، جو دو سخاوت اور شجاعت و بسالت میں دور و نزدیک مشہور تھے۔ شروع صدی انیسویں میں علاقہ بائیں۔ اور چوراسی پر مستقل قابض و متصرف ہوئے، ۱۲۴۱ھ میں حج و زیارت کے لئے جاتے ہوئے بڑودہ کے مقام پر رحلت ہوئی، وہیں مدفون ہیں، حسرت بھی قبر پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل کر آئے ہیں، ان کے بڑے لڑکے حاجی محمد داؤد خاں تھے جو نواب بہادر محمد مزمل اللہ خاں شروانی کے دادا تھے۔ یہ اپنی دینداری، فیاضی، اور کنبہ پروری، میں مشہور تھے، ۱۲۷۱ھ میں عالم جاودانی کو کوچ کیا، شاہ مقبول عالم مارہروی نے قطعۂ تاریخ لکھا۔ "ہو گئے داؤد خاں جنت مکاں" مصرع تاریخ ہے۔ اسی قطعہ کا ایک شعر یہ ہے۔

۱۲۷۱ھ

دیکھئے کیا حال بھیکن پور ہو
اس جگہ تھے دین و دولت توأماں

ان کی صداقت و دیانت کا اس قدر شہرہ تھا کہ لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل ہند نے ان کو آگرہ کا صدر الصدور

[*] عرصہ سے بھیکن پور کے بجائے یہ شرف حبیب گنج کو حاصل ہے ۱۲

مقرر کیا۔ اس وقت ہندوستانیوں کے لئے یہ عہدہ معراج کمال تھا جب تک عہدے پر رہے کسی مسلمان کی سوئی کی ڈگری مسلمان پر نہیں کی، جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ اجلاس پر جاتے تھے، کچھ عرصہ بعد مستعفی ہو کر ۱۸۴۹ء میں حج وزیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ بہادری وہمت کا یہ عالم تھا کہ علیگڈھ کا انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جو موصوف کو حاجی بابا کہتا تھا اور نہایت درجہ عزت کرتا تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے پُرہول دور میں بھیکن پور کے پل پر آکر بیٹھ جاتا ہے، موصوف ملنے گئے اور اپنے دو بھتیجوں محمد تقی خاں صاحب (والد حسرت شروانی)، ہادی یار خاں صاحب رئیس دادوں، اور ایک بھانجے فیض احمد خاں صاحب رئیس دتاولی کی سفارش کی یہ تینوں عزیز آگرہ جنٹ کے رائفل کی دستیابی کی بنا پر گرفتار کر لئے گئے تھے، آگرہ میں جب اس کا بنگلہ لوٹا گیا تھا تو سامان میں رائفل تھا جو ان میں سے کسی نے حاصل کر لیا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے رہائی کی گذارش کو تسلیم کرنے سے معذرت کی تو خاں صاحب نے بہ توفیق ایزدی لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھتے ہوئے فرمایا کہ شیطان نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ اگر میں اتنی لجاجت سے اپنے پروردگار سے عرض کرتا تو وہ ضرور سنتا۔ یہ کہہ کر اٹھ کر چل دیئے۔ خدا سے رجوع کیا اور بفضل ایزدی تینوں رہا ہو گئے۔ اسی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بنگلہ میں خاں صاحب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک لمبا چوڑا انگریز برابر کے کمرے سے داخل ہوا۔ مجسٹریٹ نے تعارف کرایا، کرنیل نے خانصاحب کے چغہ کے نیچے تلوار دیکھکر منھ بنا کر کہا کہ "ہم نے پٹھان کی تلوار بہت دیکھی ہے" خاں صاحب یہ سن کر آگ بگولہ ہو گئے اور تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ لے دیکھ پٹھان کی تلوار! مجسٹریٹ گھبرا گیا اور کرنیل کو فوراً وہاں سے ہٹا دیا اور خاں صاحب سے کہا کہ ۱۸۴۲ء کی جنگ افغانستان میں اسکے سارے بیوی بچے مار دیئے گئے ہیں اس کا دماغ ماؤف ہے۔ بڑی مشکل سے خاں صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

حسرت کے جد امجد محمد خان زماں خاں امور ریاست میں ماہر اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بیعت تھے مولانا شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی سے مسائل اربعین رسوم شادی و غم کے متعلق لکھا کر شروانی خاندان کی اصلاح کی جو ایک صدی سے اب تک قائم ہے۔ حسرت کے والد ماجد محمد تقی خاں صاحب نے انتظام ریاست برادر گرامی محمد عبدالشکور خانصاحب کے سپرد کر کے بھیکن پور سے چار فرلانگ کے فاصلہ پر جانب مشرق موضع کھلاؤلی میں ایک بلند مقام پر گڑھی بنوائی جو فرزند دلبند کے نام پر حبیب گنج سے موسوم کی اور وہیں سکونت اختیار فرمائی۔

تنظیم امور ریاست حسرت کی تعلیم کا سلسلہ ۱۸۹۳ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں ختم ہوا۔ گھر آکر ریاست کا کام سیکھنا اور دیکھنا شروع کیا، علاقہ رہر دولی میں اکثر قیام رہا۔ عم محترم کی نگرانی رہی، کاشتکاروں کی آراضی اور اسکے پیداوار دیکھے، کچے کے کھیتوں کی مساحتیں کیں نیل کا کاروبار عروج پر تھا۔ اس کی کاشت کرائی، مال تیار کرایا بھروا کر کلکتہ بھیجا، خود بھی ایک مرتبہ اسی سلسلہ میں کلکتہ کا سفر کیا، ۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۳ھ میں والد مرحوم کے انتقال کے بعد بھی عم محترم کی نگرانی میں کام

مثل سابق جاری رہا۔ ۱۹۰۷ء مطابق ۱۳۲۵ھ میں اثنائے سفر حجاز میں مراجعت کے وقت جدہ پہنچکر عم محترم کی رحلت واقع ہوئی۔
اسوقت اعزاء و حکام کی متفقہ مشاورت کے بعد کل مشترکہ ریاست کا کام حسرت کے سپرد ہوا۔ عم محترم نے سودی قرضہ تین لاکھ ریاست پر چھوڑا تھا، جس کا سود ۹٪ اور ۱۲٪ سیکڑہ تھا، ۲ لاکھ روپیہ برادر عمزاد عبدالجلیل خاں کے ذمہ تھا، حسرت نے اپنی بینظیر لیاقت و فراست سے نہ صرف یہ کہ سارا قرضہ چھ برس میں ادا کیا بلکہ وہ تمام امور خیر جو عم محترم اپنی فیاضی و سیر چشمی سے عربی و غیر عربی مدارس، اور خدمت اہل حاجت وغیرہ پر صرف فرماتے تھے بدستور جاری رکھے بعد میں نواب بہادر محمد مزمل اللہ خاں کی ثالثی میں یہ مشترکہ جائداد تقسیم ہوئی۔ نواب صاحب نے اپنے فیصلہ ثالثی میں حسرت کی دیانت و لیاقت کا اعتراف کیا۔ بعض جائدادیں رہن رکھ کر سودی قرضہ اپنے پاس سے ادا کیا اور اپنا قرضہ بلا سود محاصل آمدنی سے ریزہ ریزہ وصول کر کے جائدایں واگذار کیں، اس خدمت خلق میں ایک لاکھ قرضہ سودی مزید ادا کیا۔ مدیونوں میں مسلمان، سنی، شیعہ اور ہندو سبھی تھے۔ اپنی ذاتی جائداد کا انتظام اس طرح کیا کہ اس میں وافر اضافہ ہوا جس کی قیمت کم و بیش ۶ لاکھ روپیہ ہوئی۔

تکمیل اشواق حسرت کی زندگی تمام تر والد ماجد و عم محترم کی تربیت کی رہین منت ہے۔ والد مرحوم کو مردانہ فنون، بنوٹ، لکڑی، ورزش، کشتی اور بندوق کے شکار کا شوق تھا۔ ان تمام چیزوں میں حسرت نے بھی دخل پیدا کیا، آج بھی ۸۰ سال سے متجاوز عمر ہو جانے پر قدم قاعدے ہی سے بڑھتے ہیں۔ والد مرحوم کو اردو ادب سے بھی ذوق تھا، شروع میں حسرت کو غالب کی انشاء "اردوئے معلّٰی" پڑھنے کے لئے "عنایت کی، اسی سے "ادبی ذوق کی نشو و نما ہوئی۔ موصوف نے "سراپائے معشوق" فراہم کر کے شائع کرائی تھی جس میں سر سے پاؤں تک تمام اعضا کے متعلق اساتذہ کے اشعار جمع کئے تھے اس کا قلمی نسخہ کتابخانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد دہلی جاتے، وہاں کے عمائد مثلاً مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہما سے ملنے کا اتفاق رہتا اس وجہ سے خورونوش، نشست برخاست، لباس، ذوق صحبت میں پورا اثر دلی کی صحبت کا تھا۔

حسرت میں ادب اردو، شکار، لباس، خورونوش اور فنون مردانہ کا شوق والد مرحوم کی تربیت کا نتیجہ ہے اور علم عربی کی تحصیل، انتظام ریاست، اور مذہبی پابندی، عم محترم کے فیض صحبت کا ثمرہ ہے۔

والد مرحوم کے عطا کردہ نسخہ "اردوئے معلّٰی" نے حسرت میں وہ شوق مطالعہ کتب پیدا کیا کہ رفتہ رفتہ اس نے تقریباً سات ہزار کتابوں کا ذخیرہ جمع کرادیا، جنمیں دو ہزار سے زاید قلمی نسخے ہیں، ان میں بعض نادر الوجود، بعض اہم خصوصیات کے حامل، اور بعض عدیم المثال ہیں۔ "مونس الاحرار" جو شعرائے فارسی کے تذکرے میں ہے اب تک کی تحقیقات کے مطابق اس کا دوسرا نسخہ دنیا بھر میں کہیں نہیں ہے، یہ کتابخانہ نصف صدی سے زیادہ کی تلاش کا سرمایہ ہے۔ اس میں ایک نسخہ بھی سرقہ یا ناجائز ذریعہ کا حاصل کیا ہوا نہیں ہے اور صرف حسرت ہی کا جمع کردہ ہے۔

ایک مستقل عمدہ عمارت میں محفوظ ہے۔ کثرتِ مطالعہ نے حسرت کو صاحبِ تصنیف و تالیف بھی بنا دیا۔ بیسیوں تالیفات ہیں جن میں علمائے سلف اور نابینا علماء کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ ابھی حال میں "مقالاتِ شروانی" کے نام سے قریباً پانچسو صفحات کا مجموعۂ مضامین شائع ہوا ہے جو حقیقت میں چمنستانِ علم ہے جس میں ہزاروں قسم کے رنگ بہ رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ اس مجموعے سے حسرت کی وسعتِ نظر، کثرتِ مطالعہ، استقامتِ خیال، پختگیٔ مذہب اور اصابتِ رائے کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

قیامِ حیدرآباد نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں کی رحلت کے بعد مئی ۱۹۱۸ء مطابق ۱۳۳۶ھ میں حیدرآباد (دکن) میں صدارت امارت شرعیہ کا عہدہ نظام سرکار کی طرف سے پیش کیا گیا اور ۱۲ سال تک صدر الصدور رہ کر خدماتِ شرعیہ انجام دیکر ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو استعفا دیا۔ ۱۴ جمادی الاخری ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء کو "نواب صدر یار جنگ بہادر" کا خطاب سرکار نظام کی طرف سے ملا۔ حیدرآباد سے آنے کے بعد حج و زیارت کی سعادت سے ۱۳۴۴ھ میں مشرف ہوئے۔ اب سارا وقت یادِ الٰہی، مطالعۂ کتب، انتظامِ ریاست، اور اصدقا نوازی میں گذرتا ہے۔

ہندوستان کے تمام قابلِ ذکر تعلیمی و علمی اداروں کے رکن و عہدیدار رہے ہیں اور ...... اب بھی ہیں۔ اولاد، جائداد، ازواج، اور فراغتِ قلب و دماغ کے لحاظ سے خوش نصیب ہیں۔ خاندانِ شروانی کے درخشندہ آفتاب اور مشاہیرِ ہندوستان میں ماہتاب ہیں، اور اس دورِ قحط الرجال میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے "صدیق مکرم" ہیں۔ متعنا اللہ بطول بقائہ

اب تک دنیا نواب صدر یار جنگ بہادر کو ایک اولوالعزم رئیس، پابندِ وضعِ قدیم بزرگ، جید عالم، بلند پایہ ادیب، ماہرِ علومِ مشرقیہ فاضل، مذہبی نقاد، لائق مصنف، اور وسیع النظر مورخ کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی رہی ہے۔ ان سے قریبی تعلق رکھنے والے بھی اس صفت سے ناواقف ہوں گے کہ موصوف ایک خوش گو شاعر بھی ہیں۔ اور یہ کہ ہندوستان کے مشہور شاعر حسرت موہانی کے علاوہ کوئی حسرت شروانی بھی ہے جو نہ صرف عمر کے سن و سال بلکہ شاعری کے لحاظ سے بھی اول الذکر سے قدیم الایام ہے۔ اور خدا جانے یہ وصف کب تک پردۂ خفا میں رہتا اگر بار بار کا میرا اصرار موصوف کو ادھر متوجہ نہ کرتا۔

محمد عبد الشاہد خاں شروانی

ادارہ علمیہ، محمد علی روڈ، علی گڑھ

یکم محرم الحرام ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۹۴۷ء

اُردو غزل

غزل نظم کا ایک ضروری جُز ہے، اور جو لطف وہ اپنی نوعیت خاص سے دل کو بخشتی ہے، وہ قطعہ یا مثنوی یا قصیدے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ غزل کو ایک ایسی کیاری تصور کیجیے، جس میں رنگ رنگ کے خوشنما پھول کھلے ہوئے ہوں، اور ہر پھول کی دلفریبی دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہو۔ جو لطفِ خاص ان کیاریوں کے دیکھنے سے حاصل ہوگا وہ ان کیاریوں کے نظارے سے حاصل نہیں ہوگا جن میں ایک ہی طرح کے پھول ہوں۔ تفنّن انسان کی زندگی کو گوارا رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ میز پر ایک قسم کا کھانا میزبانوں کے سامنے لایا جاتا رہے کیسا ہی مزیدار کھانا ہو۔ دو وقت متواتر کھلا کر مہمانوں کے چہرے دیکھیے کہ میز پر وہ شگفتگی و رغبت سے آتے ہیں یا بددلی اور افسردگی کے ساتھ۔

جس طرح فارسی شاعری کی ابتدا عربی شاعری کی انتہا سے جا ملی ہے۔ اسی طرح ابتدائے اردو شاعری انتہائے فارسی غزل سے ہمدوش ہے۔ شیخ علی حزیں اور میاں ولی کا ایک زمانہ ہے۔ اگلے اساتذہ اُردو کبھی کبھی طرح بھی فارسی غزل کی انتخاب کرتے تھے۔ مثلاً:

فارسی ؎ مے گرفتیم بجاناں سرِ راہے گاہے | او ہم از لطفِ نہاں داشت نگاہے گاہے

اُردو ؎ سرسری اُن سے ملاقات ہے گاہے گاہے | محفلِ غیر میں گاہے سرِ راہے گاہے

اُس زمانے کے اُردو کے استاد اردو فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر متقدمین (بلکہ بعض متاخرین) نے اُردو، فارسی دونوں دیوان مرتب و مدون کیے۔ اس اختلاط اور ربط و ضبط کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ فارسی غزل کی پیروی اُردو غزل کرے۔ اور شیراز و اصفہان کے ترانوں کی صدا دہلی اور لکھنؤ کے مشاعروں میں گونجے۔ تم اُردو شعرا کی نکتہ سنجی اور قوتِ بیان کی جس قدر چاہو تعریف کرو۔ لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ علم و فضل میں کامل نہ تھے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کے دماغ ایسے

زبردست اور پُر قوت نہ تھے کہ ایجاد و اختراع پر قادر ہوتے۔ ایجاد کا دروازہ بند تھا تو تقلید کی شاہ راہ کھلی ہوئی تھی۔ جو مضامین انھوں نے فارسی غزل میں دیکھے انھیں کو علوم متعارفہ قرار دیکر اردو غزل کی شکل پیدا کی۔

غزل میں چار چیزیں ہو سکتی ہیں' مضمون، خیال، زبان' طرز ادا'۔ اُردو غزل میں مضامین قریبًا فارسی غزل کے ہیں خط و خال، زلف و کمر، ناز و کرشمہ، وحشت و افسردگی، شگفتگی و خستگی، شمع و پروانہ، بلبل و گل، قیس و لیلیٰ، اور فرہاد و شیریں ؛ یہ تمام مضامین فارسی غزل کے ہیں۔ اور اردو غزل کی بساط بھی اتنی ہی ہے۔ خیال کی ترقی اور وسعت' قوتِ دماغ کے تابع ہے جو ممارست علوم سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ممارستِ علوم' اردو شعرائے کے حصے میں نہیں آئی۔ لہٰذا قوتِ خیال کے کرشمے اردو غزل میں بہت کم ہیں۔ اب صرف دو چیزیں رہ گئیں۔ ایک زبان دوسرے طرز ادا! بس انھیں دو میدانوں میں اُردو کے جوہر کھلتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی آب و تاب دیکھ کر جوہری حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ میر و مرزا سے لے کر ذوق و اسیر تک بلکہ داغ و امیر تک نظر ڈالو وہی خیال و مضمون پاؤ گے۔ فرق ہے تو زبان اور طرز ادا کا۔ ایک ہی خیال و مضمون پر سوسائٹی کے تغیر سے جو اثر پڑا ہے وہ البتہ مختلف طبقوں میں محسوس ہوتا ہے ؛ مثلاً مصحفی و جرأت کے یہاں مستی اور بھندی پاؤ گے۔ متاخرین کے یہاں نہیں ہے۔

فارسی غزل کو دیکھو۔ مضامین اس میں بھی قریبًا متحد ہیں، لیکن یہاں سے وہاں ایک بات زائد ہے' یعنی خیال۔ اس خیال کی نیرنگی نے غزل فارسی کو ایک ایسا شاہد رعنا بنا دیا ہے۔ جس کے جلوؤں کی انتہا نہ ہو۔ جب دیکھو ایک نیا جلوہ دیدہ افروز ہوگا۔ اور پہلا جلوہ دوسرے سے اتنا ممتاز ہوگا کہ یہ سمجھنا مشکل ہو جائے گا کہ آیا یہ وہی آفتِ روزگار ہے جو پہلے جلوہ گر تھا یا اور ہے۔ مولانائے روم، عطار، سعدی، خسرو، حافظ، فغانی، شفائی، نظیری، عرفی، ملک قمی، ظہوری، طالب آملی، اور حزیں کے کلام کو غور سے دیکھو تو صاف صاف عیاں ہو جائے گا کہ ہر چند یہ سب (باعتبار سخن) ایک ہی آسمان کے تارے ہیں لیکن ان کے بروج و منازل ایک دوسرے سے اس قدر بعید و

متفاوت ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ ع

ہر یکے را آسمانے دیگر است!

ایک کی روشنی کا رنگ دوسرے سے اتنا ممتاز ہے کہ ہر ایک کو دیکھ کر بیساختہ زبان سے نکلتا ہے کہ یہ نیا رنگ ہے۔ یہ خیال کی وسعت و نیرنگی ان کے علم و فضل کا کرشمہ تھا۔ سنائی کے کمالِ فلسفہ کو میر باقر داماد نے مانا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا سند ہو سکتی ہے۔ پچھلی چند صدیوں میں بہت کم فضلا ایسے ہوئے ہوں گے جو ملا جامی کے ممنونِ احسان نہ ہوں۔ سعدی کے کمال کا سلسلہ اس سرچشمہ تک پہنچتا ہے جو لب دجلہ علوم کے دریا بہا رہا تھا یعنی نظامیہ بغداد! علیٰ ہذا القیاس غزل فارسی میں جس چیز نے شور محشر بپا کر رکھا ہے وہ تصوف ہے۔ فارسی غزل گویوں میں بہت سے باکمال ایسے ہوئے ہیں جن کے سینوں میں عشق کی حقیقی آگ شعلہ زن تھی۔ یہ شعلے جب منہ سے باہر آئے غزل کہلائے۔ خواجہ سنائی مولانائے روم، شیخ عطار، شیخ نعمت اللہ ولی، سید قاسم انوار قدس سرہم وہ بزرگ ہیں۔ جو بزم انس اور انجمن سخن دونوں کے صدر نشین تھے۔ ان سے نیچے طبقے میں باعتبار تصوف سعدی، خسرو، جامی وغیرہ ہیں۔ ایک طبقہ وہ تھا جو بظاہر اہلِ باطن نہ تھا لیکن قوتِ خیال کی مدد سے تصوف کے جوہر اپنے کلام میں چمکا گیا۔ مثلاً نظیری کہلائے۔ اردو میں میر درد علیہ الرحمۃ ایسے گزرے ہیں جو عشق حقیقی کے لذت یافتہ تھے ورنہ بہت سے ایسے تھے جن کو غالباً عشق مجازی سے بھی مناسبت نہ تھی۔

فارسی غزل کو جس پائے کے مربی ملے وہ اردو کو کہاں نصیب ہوئے۔ میر علی شیر اور مرزا عبدالرحیم خانخاناں تو بہت اعلیٰ مثالیں ہیں کم و بیش ہر ایک دربار باقاعدہ مربی فن تھا۔ عہدِ محمود سے زمانہ شاہجہاں تک ملک الشعرا دربار کا ایک باضابطہ رکن نظر آتا ہے۔ فرمانروا کا اثر شعرا کے دماغ پر کیا پڑتا تھا اسکو دیکھنا چاہئے تو فیضی، طالب آملی، کلیم ہمدانی کو دیکھو۔ اکبر کی جامعیت، جہانگیر کی رنگینی، شاہجہاں کے زہد کا جلوہ ان کے کلام میں دیکھ کر تم پہچان لو گے کہ کون کس کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔

اردو شاعری کو مربی نہ دلی میں ملا نہ لکھنؤ میں۔ دربارِ دہلی میں سخنوری تھی، حوصلہ پیدا کرنے کا ساز و سامان نہ تھا۔ دربار لکھنؤ میں دولت تھی، دماغ سخن نہ تھا۔ کمالِ سلطنت کے زمانے میں شاعر کامل فن (شیخ ناسخ)

دشتِ غربت کی خاک چھانتا پھرا۔ البتہ دونوں جگہ کی سوسائٹی میں جان تھی۔ جو کچھ ہے اُسی کی برکت ہے۔ دربار باندہ اور رامپور نے بھی کچھ جھلک دکھلائے۔ لیکن تربیتِ فن کچھ اور ہی اسباب چاہتی ہے۔ حیدرآباد (خدا اسکو آباد رکھے) غالباً اس غرض کے واسطے موضوع نہیں ہوا۔

قصّہ مختصر اسباب جو کچھ ہوں غزلِ اُردو میں خیال بہت ہی محدود اور کمزور رہے اور اسکو وسعت اور ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جو غزل اردو لکھے وہ پریشان روزگار، خمیدہ کمر، دیوانہ، افسردہ دل، زندگی سے بیزار، ہجراں نصیب ہی ہو۔ یہ کیا فرض ہے کہ جس پر اُردو شاعر فریفتہ ہو وہ زمانے بھر کا عیار، ازلی ظالم، بیوفا، ہرجائی، غرض صفات مذمومہ کا مجموعہ ہو۔ کیا سخن سرائی زلف کے پیچ و خم اور دہن کے عدم میں ایسی گم ہوگئی کہ اب اسکو وہاں سے نکلنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ اگر ہجراں میں لذتِ درد ہے تو کیا وصل میں لطف و نشاط نہیں۔ پھر کیوں اس کو برباد ہی رکھا۔ کیا لازم ہے کہ جب صبح ہو تو قیامت ہی آئے۔ کیا وہ صبح عالم امکاں میں نہیں؟ جو سرورِ وصل سے سرشار دماغ پر جلوہ گستر ہو۔ کیا واجب ہے کہ ہم بھی وہی ادائیں دیکھیں جو ان آنکھوں کو نظر آئیں جو ایک سانس میں بارہ سو سے زائد ڈنڈ پیلتے تھے۔ کیا شیخ جی کی پگڑی اتار کر دھول جمانے کے سوا اور کوئی دل لگی دنیا میں نہیں رہی جو ہم بھی طبیعت کو خوش کرنے کے واسطے شیخ جی ہی کی تلاش کرتے پھریں۔

خلاصہ کلام! خیال کو تقلید کے دائرۂ تنگ سے نکالنا چاہیئے۔ جو جس عالم کا جلوہ دیکھے، اسی کا جلوہ دکھائے۔ ہاں آزادیِ خیال کے یہ معنی نہیں کہ گھوڑے کی لگام اتار کر اسکو چھوڑ دو کہ باولوں کی طرح بھاگتا پھرے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اُستاد چابک سوار کی تعلیم کے بعد گھوڑے اپنی اپنی رفتار کے جوہر دکھاتے ہیں اسی طرح تربیت آشنا اور بامذاق خیالوں کو اپنا اپنا رنگ دکھانیکی اجازت دو۔ یہ اصرار مت کرو کہ بڑے میاں سر ہلاتے ہوئے قدم قدم گھوڑے کو لے گئے تھے۔ لہٰذا ہم بھی اسی ہیئت کذائی سے اسی راستے پر انھیں کے نقشِ قدم پر چلائیں گے۔ روشِ رفتار سیکھو ان سے، جلوان میدانوں میں، جو تمھاری نگاہ کے سامنے ہیں۔

"پائے مرا لنگ نیست ملک خدا تنگ نیست"

شعرائے فارسی کو جو موقعے وسعتِ خیال کے ملتے گئے۔ اُن سے وہ خوش اسلوبی کے ساتھ نفع اُٹھاتے رہے۔ عہد غزنوی و سلجوقی کی معرکہ آرائیوں کی یادگار، تیغ چشم، کمال ابرو، تیر نظر، ترک چشم فارس کی دلفریبیوں کی بہار، گلزار کے تلازمے، میخانے کے لوازمے، آتشکدوں کے پرکالے، ترسازادہ، مغبچہ، ہندوستان کا خراج، بتکدہ، بیت و صنم، برہمن، سومنات، زنار، برشکال، ستی، ہندو، خیال شاعری کی قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک دو ہاتھ کا ڈورا (زنار) کیسے کیسے دلکش و دلفریب تماشے دکھلا گیا۔

جب یہ حالت اساتذۂ فارسی کی رہی تو کیا وجہ کہ ہم اس عمدہ صفت میں ان کی پیروی نہ کریں جو میدان مغربی روشنی نے ہم کو دکھائے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان کے گل بوٹے سے ہم کاشانہ ادب کو آراستہ نہ کریں جبکہ باغوں میں صدہا پھول دل ربایانہ انداز دکھلا رہے ہیں تو کیا سبب کہ ہم دامن خیال میں گل دیا سمن اور لالے کے سوا اور کوئی پھول چن کر نہ رکھیں۔ گلاب جب ایکہزار رنگ میں جلوہ فرما ہے تو ہم کیوں صرف گل سُرخ کے بلبل بنے رہیں۔

اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے غزل گو بھاکھا کے لٹریچر سے واقفیت حاصل کریں اور اس کے مضامین لطیف کو سلیقہ اور تمیز کے ساتھ اردو میں لائیں۔ بھاکھا میں محبت کے بعض مضامین ایسے لطیف اور پاکیزہ ہیں کہ ذوق سلیم کو آئینۂ حیرت بنا دیتے ہیں۔ تصوف کی رُوح اُردو غزل میں پھونکنی چاہیئے۔ جو دل و دماغ اس بادۂ مرد افگن سے سرشار نہ ہوں وہ خواجہ میر درد، شاہ نیاز احمد صاحب، اور شاہ تراب علی صاحب کے دیوان دیکھ کر جوشِ بیان و خیال کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ توکل و قناعت وغیرہ کے وہ مضامین جو فال میں آکر آدمی کو نکما کر دیتے ہیں اور اپاہج بنا دیتے ہیں ہرگز مسائل تصوف نہیں اُن سے احتراز چاہیئے۔ ایسے مضامین اور الفاظ سے پرہیز لازم ہے جن سے امرد پرستی کا رنگ جھلکتا ہو، فارسی اور اردو غزل کا مکروہ، وہ حصہ ہے جو مضامین امرد پرستی کا جلوہ دکھلاتا ہے۔ رقابت کا مفہوم بھی جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیئے۔ اس کی تے اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بے حمیتی کے درجہ تک

پہنچ گئی ہے۔ ایک اور حصہ ہے جو قابل حذف ہے یعنی شکایتِ زمانہ آسماں کو گالیاں دینا، اپنی حالت کو یاس کے مرتبے میں خوار وخستہ ظاہر کرنا، یہ مضامین جوہر مردانگی کو مٹاتے اور دلوں میں افسردگی پیدا کرتے ہیں اور اس زمانے میں (جبکہ دلوں کو ابھارنے اور ان میں امنگ پیدا کرنے کی شدید ضرورت ہے) بالخصوص ان مضامین کو یکقلم قلم زد کردینا واجب ہے۔ وہ مضامین بھی جن سے انبیاء کی توہین اور معجزات کی تحقیر ہوتی ہے ضرور ترک کردینے کے لائق ہیں۔ یہ مضامین، دل میں سوءِ ادب اور بدزبانی کی خصلت پیدا کرتے ہیں۔ اور اس طرح انسان ایک عمدہ صفت ادب سے محروم ہوجاتا ہے۔

آخر میں یہ کہہ دینا ضرور ہے کہ زبان اور اصول نظم میں ہم کو اساتذۂ فن کی تقلید لازمی طور پر کرنی چاہئے اور جو زحمت اس میں ہو اس سے بچنے کے لئے فضول حیلے نہیں تراشنے چاہئیں۔ انتخاب مضامین اور ان کو ادا کرنے میں ذوق سلیم اور خوش اسلوبی سے کام لینا چاہئے۔ یہ نہو کہ خس وخاشاک کا انبار، چمنستانِ غزل میں کردیں، اور اس کی مزخرف صورت دیکھ دیکھ کر محض اس خیال سے خوش ہوں کہ ایک نئی شکل نکل آئی ہے۔[۱]

۱؎ مقالات شروانی صفحہ ۸۵—۹۰

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو — شیئاً للہ از جمالِ روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما — آفریں بر دست و بر بازوئے تو

کاروانِ حسرت

یعنی

دیوان اردو

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں حسرت شروانی

مع

تقریب و تذکرہ از مولانا محمد عبد الشاہد خاں شروانی

بار اول
مطبوعہ مدینہ پریس بجنور
قیمت ۱۲ عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ردیف الف

چشم ساقی کا جو ایما ہو گیا
رند میکش شیخ صنعا ہو گیا

مر گیا میں اب تو حسرت پوری ہوئی
لو مری جاں اب تو کہنا ہو گیا

ہر گراں جاں کو ہے شوق جنس درد
کس قدر سستا یہ سودا ہو گیا

آفتِ جاں تیری قہر آلودہ چشم
راحتِ جاں تیرا ہنسنا ہو گیا

کچھ نہ دیکھی ہم نے تاثیر فغاں
روتے روتے اک زمانہ ہو گیا

آ گئی جب یاد اُس بیدرد کی
درد سا اک دل میں پیدا ہو گیا

آمد آمد سے مرے سفاک کی
حشر میں اک حشر برپا ہو گیا

دل اُڑا کر لے گئی اُس کی نظر
وہ پری رو مفت رُسوا ہو گیا

دیکھ کر آئینہ وہ بُت بن گئے　　مجھ سے بڑھ کر ان کو سکتا ہو گیا

حسرت دیوانہ دل دیکر اُنھیں

اک زمانے کا تماشا ہو گیا

برطرح مرزا غالب دہلوی

بت بیدرد کا غم مونسِ ہجراں نکلا　　درد جانا تھا جسے ہمنے وہ درماں نکلا

آنکھ جب بند ہوئی تب کھلیں آنکھیں اپنی　　بزمِ یاراں جسے سمجھے تھے وہ زنداں نکلا

حسرت و یاس کا انبوہ فغاں کی کثرت　　میں تری بزم سے کیا باسر و ساماں نکلا

خون ہو کر تو یہ دل آنکھ سے برسوں ٹپکا　　نہ کوئی پر دلِ ناکام کا ارماں نکلا

آئینہ۔ پیکرِ تصویر۔ نگاہِ مشتاق　　جسے دیکھا تری محفل میں وہ حیراں نکلا

مجھکو حیرت ہی ہوا کیا دمِ رخصت ہمدم　　جان نکلی مرے پہلو سے کہ جاناں نکلا

خوب دوزخ کی مصیبت سے بچے ہم حسرت

اُس کا داروغہ وہی یار کا درباں نکلا

چشم افسوں ساں نے کیا کر دیا　　کچھ جنوں سا دل میں پیدا کر دیا

کس کے غم میں ہیں لبِ خنداں خموش کس نے تیرے گل کو غنچا کر دیا
سر گذشتِ غم سنائی تھی اُسے بدگماں نے اُس کو شکوا کر دیا
کس قیامت قد کی یہ رفتار ہے جس نے عالم زیر و بالا کر دیا
میں نے حالِ دل چھپایا تھا مگر صورتِ حیراں نے افشا کر دیا
کس کی یہ چشمِ سخنداں کا ہے فیض مجھ سا بیخود جس نے گویا کر دیا
بدگمانی اُس کی کم ہوتی نہیں کس پہ یارب مجھ کو شیدا کر دیا
تیرے سودائی نے حالِ دردِ دل جب کہا اک حشر برپا کر دیا
کیا بلا تھی آنکھ اسکی جس نے دل اک نظر میں پارہ پارہ کر دیا
فصلِ گل کا فیض تو معلوم ہاں سر میں کچھ سودا سا پیدا کر دیا

وصل کی شب ہائے وہ کہنا ترا
مجھکو حسرت تو نے رسوا کر دیا

پھر بتِ بے حجاب یاد آیا مایۂ اضطراب یاد آیا
دل میں کچھ گدگدی سی ہوتی ہے ہائے کس کا شباب یاد آیا

دل سے رخصت ہوں سب تمنائیں — وہ سراپا حجاب یاد آیا

پھر کسی کی گلی کو جاتا ہوں — دلِ خانہ خراب یاد آیا

خود فراموش سے ہو کچھ حسرت

آج کون اے جناب یاد آیا

سلسلہ جدید ۳

(طرح)

(داغ دہلوی)

ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں

وہ تماشا نظر نہیں آتا

روئے زیبا نظر نہیں آتا — اپنا جینا نظر نہیں آتا

لاف الفت بہت زمانے میں — مرنے والا نظر نہیں آتا

دردِ دل کی دوا ہے جسکی نظر — وہ مسیحا نظر نہیں آتا

گل و گلشن سے کیا تسلی ہو — گلِ رعنا نظر نہیں آتا

پھول بوٹے بہت ہیں گلشن میں — سرو بالا نظر نہیں آتا

طبع مواج کے مقابل ہو — ایسا دریا نظر نہیں آتا

جس پہ مٹ جانے کی تمنا ہے — وہ سراپا نظر نہیں آتا

چھان ڈالا جہان اُسکے لئے — نہیں آتا نظر نہیں آتا نمبر ۲۹ مرحوم

جسمیں وحشت کے حوصلے نکلیں — ایسا صحرا نظر نہیں آتا جمیل ۲۹ مرحوم

تھک گئی تارے گنتے گنتے نگاہ — ماہ سیما نظر نہیں آتا

جسمیں صورت نما ہو نقش مُراد — ایسا نقشا نظر نہیں آتا نمبر مرحوم

لاکھوں جلوے نظر میں ہیں حسرت

جلوہ فرما نظر نہیں آتا

نمبر مرحوم

س۔ ج ۲ (طرح) — کوئی سمجھو مفت میں حضرت کا نقصان ہو گیا

(مرزا داغ دہلوی)

جلوہ فرما تو ہوا صحرا گلستاں ہو گیا — تو چلا منہ پھیر کر گلشن بیاباں ہو گیا

نور تھا عنقا صفت ظلمتکدے میں دہر کے — وہ جمال جانفزا شمع شبستاں ہو گیا

ماہ کو کیا نسبت اس شمع جہاں افروز سے — جسکے پروانوں میں فرد ادنیٰ مہر رخشاں ہو گیا

اللہ اللہ وہ رخ انور کہ جسکے نور سے — ذرہ ذرہ ہمسر خورشید تاباں ہو گیا

جان و دل اسیر فدا جسکی بہار حسن سے — کفر کا وحشت کدہ بستان ایماں ہو گیا

ن۔ غ۔ ل۔ م

کر دیا راہِ وفا میں عمر کا قصہ تمام
شکر للہ زندگی کا خوب ساماں ہو گیا

غنچہ باغ دہر میں جب تھا تو خاطر جمع تھی
جب دہن کھولا بہ رنگِ بو پریشاں ہو گیا

اب ابد تک سرکشی زیبا نہیں انسان کو
جب ازل میں بندگی کا عہد و پیماں ہو گیا

عالمِ تصویر سے بالا ہے حسنِ دل ربا
نقشِ حیرت بن گیا نقاش حیراں ہو گیا

نونہالانِ چمن کو ہو مبارک عہدِ گل
اپنا نخلِ آرزو تو نذرِ حرماں ہو گیا

کر دیا تھا کام ہی اپنا تو فرقت نے تمام
چارہ سازِ دردِ دل اک لطفِ پنہاں ہو گیا

ضبط کیا جب ہوئے شوقِ جبہ سائی جانگداز
قیس نے دیکھا سگِ لیلیٰ تو قرباں ہو گیا

سینۂ حسرتؔ کہ جورِ ہجر سے ویران تھا
ایک پری پیکر کے جلووں سے پرستاں ہو گیا

۱۳۴۸ھ
۲۲ ربیع الاول
جمعرات

س سج ۵ (طرح)

قدرِ شبِ تمنا فرقت میں ہو گئی اے دل
ہر روز ماہ ہو گا ہر ماہ سال ہو گا

(تسلیم لکھنوی)

حالِ دروں کا چھپنا اُس دن محال ہو گا
جب قال حال ہو گا جب حال قال ہو گا

قدموں پہ شاہِ دیں کے جب ہو گا سر ہمارا
تب اوج پر ہمارا جاہ و جلال ہو گا

غیروں کی کجکلاہی باقی رہیگی کبتک ——— ابرو کے بل کی کنجی اپنا بلال ہوگا

سر پہ ہیں جو بلائیں آئینگی زیرِ پا بھی ——— جس کو کمال ہوگا اسکو زوال ہوگا

ہوش و خرد پہ یارب گذریگی کیا قیامت ——— بے پردہ جلوہ فرما جب وہ جمال ہوگا

ہو جائے پارہ پارہ گو تار و پود ہستی ——— زائل کبھی نہ دل سے تیرا خیال ہوگا

ہے آج تمکو فرصت کچھ کام کر دکھاؤ ——— اوروں کے ہاتھ میں کل یہ ماہ و سال ہوگا

تقویمِ سالِ نو میں ہو کاش وہ گھڑی بھی ——— حسرت زدوں کو حاصل جسمیں وصال ہوگا

ہے دل میں یہ تمنا ہو جاؤں آپ پہ قرباں

گر بن پڑا یہ مجھ سے حسرت کمال ہوگا

۱۲ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی سے شناسائی قدیم ہے۔ ایک کارڈ میں مومن کا

یہ شعر اُنھوں نے نقل کیا۔

ان نصیبوں پہ کیا اختر شناس ——— آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

میں نے خط لکھا تو یہ شعر موزوں کر کے لکھ دیا۔

کیا نصیبا ہے کہ ہوں اختر شناس ——— آسماں بھی ہے کرم ایجاد کیا

۱۷۔ جمادی الاولی ۱۳۶۴ھ

(بیاض ۱۳۰۳ھ)

تیغ نگاہِ یار کی بُرّش کو دیکھنا
زخموں کے منھ کھلا گئے اور ہیں سیا کیا

شب کو کنارِ غیر میں سویا کئے جو آپ
ہیں خواب ہی ہیں آپ کے بوسے لیا کیا

(بوقت طوفان نیم ندی بھیکم پور)

ہم بیکسوں سے بغض فلک کو ہے کس قدر
اک تھی نمود قبر اُسے بھی مٹا دیا

عبرت کدہ مزار رئیسوں کا ایک تھا
کیا جانئے فلک نے اُسے کیوں بہا دیا

تھے آرمیدہ اسمیں رئیسانِ نیک ذات
حاتم کو جنکی بذل نے دل سے بھلا دیا

داؤد خاں و خان زماں خانِ باصفا
کسریٰ کو جنکے عدل نے گویا جلا دیا

دنیا کے عیش چھوڑ کے سوئے تھے قبر میں
اے چرخ تو نے انکو وہاں بھی جگا دیا

یاد تھی دل میں تری آہ لبوں پر جاری
لطف کیا باغ میں جا جی تری میں پایا

رمضان ۱۳۰۳ھ

آنکھ جب بند ہوئی تب کھلیں آنکھیں اپنی
بزم یاراں جسے سمجھے تھے وہ زنداں نکلا

ہم پائمالِ ہجر عدو کامیاب وصل
اے چرخ دوں نواز ستم کی ہے انتہا

سہرا مجتبیٰ شیخ ارتضیٰ علی صاحب کاکوروی

(۳۰ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ)

ہوا زیبِ رُخِ پُر نور سہرا | لگی جنّت میں گانے حور سہرا
مہک اُٹھا گلِ عارض کی بُو سے | مئے لب سے ہُوا مخمور سہرا
جھلک سے چہرۂ روشن کی تیرے | بنا تارِ شعاعِ نور سہرا
ہُوا فیضِ نگاہِ سرمگیں سے | متاعِ حسن سے معمور سہرا
عجب کیا آتشِ رُخ کے اثر سے | جل اُٹھے مثلِ شمعِ طور سہرا
کیا تابِ عذارِ آتشیں نے | نگاہِ بزم سے مستور سہرا
ہُوا ہے بختِ عالی کی مدد سے | دیارِ حسن پر منصور سہرا
کھلے غنچے خوشی سے جب بنے کو | پہننا ہو گیا منظور سہرا
پروئے ہیں زبس دُرِّ معانی | بنا رشکِ دُرِ منثور سہرا

بنا کاغذ کا تختہ تختۂ باغ
کیا واؔمق نے جب مسطور سہرا

خواب میں شب ۱۹ صفر ۱۳۶۴ھ کو یہ شعر موزوں ہُوا۔

اے بندہ نواز بندہ پرور
قربان ہوں تجھ پہ سب کے سر

دوسرا مصرع ناموزوں تھا لہذا بدلا گیا بیدار ہو کر۔

اے بندہ نواز بندہ پرور
بندہ کو نواز لطف فرما

ایک رسالہ مولفہٗ قاضی احمد میاں اخترؔ جوناگڑھی دیکھکر میں نے لکھا۔

ان نصیبوں پر میں ناز اں ہوں کہ آج
"اختر" تاباں ہے پھر دیدہ فروز

ردیف میم

قطرۂ اشک کا مژگاں پہ مرے یہ عالم
صُبحدم گھاس کی پتّی پہ ہو جیسے شبنم

حسرتیں دل کی نکل جاتیں ذرا تو اے کاش
ایک ہی رات کو مل بیٹھتے ہم تم باہم

سر میں انسان کی منصوبے بھرے تھے کیا کیا
ہائے پر موت نے سب کر دیئے درہم برہم

بے نیازی نے کیا خون تمنّا کا مری
سینہ میں دل کے تڑپنے سے ہے برپا ماتم

سر سے جاتے رہے اک عمر کے شکوے حسرتؔ
مل کے جب بیٹھ گئے دو گھڑی ہم وہ باہم

ذی الحجہ ۱۳۰۳ھ

سلسلہ جدید ۲

(طرح)

(خواجہ آتش لکھنوی)

جہان و کار جہاں سے ہوں بیخبر میں مست
زمیں کدھر کو کہاں آسماں نہیں معلوم

ہے کشتہ کس کی نظر کا جہاں نہیں معلوم
چلی کدھر سے یہ تیغِ رواں نہیں معلوم

ہجومِ شوق سے سینہ تو ہے تمنّا زار
حدیثِ شوق ہو کیونکہ بیاں نہیں معلوم

زباں پہ جورِ فلک کی شکایتیں ہیں بہت
ہے کس کے در پہ جھکا آسماں نہیں معلوم

یہ محو ہی سرِ شوریدہ سجدہ ریزی میں
جبیں کدھر ہی کہاں آستاں نہیں معلوم

مٹا چکے رہِ الفت میں ہم نشاں اپنا
فدا ہی جس پہ دل اسکا نشاں نہیں معلوم

نگاہِ ناز کے کشتے تڑپتے ہیں لاکھوں
گری کدھر ہی یہ برقِ تپاں نہیں معلوم

نثار کر دیئے دل تو تمام عالم نے
کہاں ہے جلوہ گرِ دلستاں نہیں معلوم

رواں ہے قافلۂ عمر تیز گامی سے
کہاں ٹھہرتا ہی یہ کارواں نہیں معلوم

وہ کیف ہی سرِ حسرت میں فیضِ ساقی سے
مکاں ہی میکدہ یا لامکاں نہیں معلوم

(۱۹ صفر المظفر ۱۳۴۲ھ حیدر آباد)

مخمّس بر غزل حضرت امیر خسرو دہلوی

(نوشتہ قدیم)

قیامت کا سماں تھا اور محشر خیز تھا عالم
متاعِ ہوش پر گرتی تھیں ہر سو بجلیاں پیہم
صفیں تھیں جلوہ قاتل سے ساری برہم و درہم
نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم
بہر جا رقصِ بسمل بود شب جائیکہ من بودم

پری روئے سمن بوئے سراپا ناز دلدارے
بہ گیسو غیرتِ سنبل بعارض رشکِ گلزارے
بلائے ہوش عیارے ستمگارے جفاکارے
پری پیکر نگارے سرو بالا لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود شب جائیکہ من بودم

غضب کی کشمکش تھی حوصلہ فرسا تھے سب ساماں
ادھر تو تھی بھری دل میں ہزاروں حسرت ارماں
ادھر دل خوف افشا سے بسان بید تھا لرزاں
رقیباں گوش برآواز او در ناز من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

جگر بریاں نفس سوزاں نظر ششدر عجب منظر — بھیانک تھی شبِ تاریک وحشت خیز بام و در
پریشاں ہوش سر تا سر سمجھ مختل خرد مضطر — فغاں بر لب الم در دل قلق در جاں اجل بر سر

بلا ہائے تو نازل بود شب جائیکہ من بودم

بیابانِ طلب میں موج زن ہے آگ کی اک رَو — شراروں سی پکار اُٹھتی ہیں جسکے الحذر رہرو
یہ دامن جھاڑ کر بولا پڑا جس پر ذرا پرتو — مرا از آتشِ عشق تو دامن سوخت اے خسرو

محبت شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

تعالی اللہ زہے طالع میں جا پہنچا کہاں خسرو — جہاں چرخِ نہم کا بھی نہ تھا نام و نشاں خسرو
صفت اُس بزمِ اعلیٰ کی کروں کیونکر بیاں خسرو — خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو

محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

(۱۹ ربیع الاوّل ۱۳۵۳ھ)

ردیف نون

سلسلۂ جدید ۷

(طرح) خاک میں ملجائے دل گر مدعا پیدا کروں
(داغ دہلوی) جب مٹالوں ایک کو تو دوسرا پیدا کروں

زندگی گر دے خدا عالم نیا پیدا کروں
روز ہو ہو کر فنا رنگِ بقا پیدا کروں

جلوہ گاہِ ناز میں کیونکر رہوں ثابت قدم
ہر جفا کا ہے تقاضا اک وفا پیدا کروں

حاصلِ صد زندگانی اک متاعِ درد ہے
حضرتِ ناصح کو یہ ضد ہے دوا پیدا کروں

یاں تو اظہارِ تمنّا واں خموشی کی ادا
مدعا یہ ہے دلِ بے مدعا پیدا کروں

ایک ہی کا حسن ہے جلوہ نما کونین میں
دوسرا تو جب کہوں جب دوسرا پیدا کروں

چارہ سازِ دردِ دل تو ہی ہے ربِّ بے نیاز
تیرے ہوتے دوسرا کیوں اے خدا پیدا کروں

دل کا ارماں ایک سی ہو ایک سے ھکر انتخاب — کونسا ہمدم مٹاؤں کونسا پیدا کروں
سر کے دعوی سب مٹا کر دل میں دیکھوں روئے دوست — خود نمائی ہو چکی قبلہ نما پیدا کروں

حسنِ روز افزوں کی جلوی ہیں غضب کے دلربا
کس طرح ہر روز حسرت دل نیا پیدا کروں

(۱۶ر جمادی الاوّل ۱۳۴۴ھ)

سلسلہ جدید ۸

(طرح - جلیلؔ) بے پیے آپ تو سرشار ہوئی جاتے ہیں

پھول فرقت میں نری خار ہوئی جاتی ہیں — ہلکے پھلکے ہیں مگر بار ہوئے جاتے ہیں
بھولے جاتے ہیں تمہی یاد میں کونین کو ہم — کام کی بات ہی بیکار ہوئے جاتے ہیں
تلے جاتے ہیں مری قتل پہ موئے مژگان — کیسے نشتر ہیں کہ تلوار ہوئے جاتے ہیں
یاد آتی ہے جو رہ رہ کے وہ چشمِ مخمور — آج تو بے پیے سرشار ہوئے جاتے ہیں

دھوم ہے دستِ شفا کی ترے چشمِ بیمار　　اچھے اچھے ترے بیمار ہوئے جاتے ہیں

فیضِ قاتل سے یہ ہے جوشِ شہادت طلبی　　خضر بھی زیست سے بیزار ہوئے جاتے ہیں

تابشِ حسن سے خیرہ ہے نگاہِ مشتاق　　وہ عیاں ہیں مگر اسرار ہوئے جاتے ہیں

نگہِ ناز سے ساقی کے ہیں دل چکنا چور　　ٹوٹتے ٹوٹتے انبار ہوئے جاتے ہیں

ٹپکی پڑتی ہے نگاہوں سے مری حسرتِ دید
فاش حسرتؔ مرے اسرار ہوئے جاتے ہیں

۱۵ رمضان ۱۳۲۸

ردیف واو

غزل در منقبت حضرت سلطان المشائخ حسب فرمائش
اخی مرحوم محمد احمد سعید خاں صاحب رئیس دادون
بتاریخ ۹ جمادی الاولی ۱۳۳۰ھ۔ نوشتہ شد غفرلہ

سلطانِ مشائخ پہ دلِ زار فدا ہو　　وہ خسروِ دوراں ہے جو اس در کا گدا ہو

تم دیدۂ ظاہر کی رسائی سے ورا ہو　　تم کو کوئی کیا سمجھے کہ محبوبِ خدا ہو

سلطان جی سرکار سے کچھ ہم کو عطا ہو　　ہم آپ کی چوکھٹ کے بھکاری ہیں بھلا ہو

اللہ کے پیارے ہو وہ ہو تابع فرمان راضی ہو خدا تم سے یہ راضی برضا ہو
کشافِ حقائق ہو ادا فہمِ حقیقت تفسیرِ ولایت ہو زباندانِ ولا ہو
نیرنگیِ اخلاص کا کچھ رنگ جدا ہے یہ محوِ محبت ہو کہ محبوبِ خدا ہو
ہو عقد فریدی کے عجب گوہر یکتا روشن گہر ایسے ہو کہ خود نور ہدیٰ ہو
یکتائے زماں نشۂ وحدت میں ہیں سرشار اللہ میں فانی ہو شہ ملکِ بقا ہو
خالق کی اطاعت میں دل و جاں سی ہو سرگرم مخلوق کو خالق کی طرف راہ نما ہو
ہے قبلہ کا رخ جسکی طرف روزِ ازل سی اس قبلۂ مقصود کے تم قبلہ نما ہو

سلطانِ مشایخ کے گدا شاہِ جہاں ہیں
سر حسرتِ بے مایہ کا اس در پہ فدا ہو

اسکے در پر خوف سی جمتی نہیں محشر کے پانو کس طرح سنبھلیں الٰہی میری نامہ بر کے پانو
گھومتا ہی جوشِ وحشت میں مثالِ چرخِ پیر تیری در پہ جا کی دم لینا جو ہوتی سر کے پانو
میری آنکھوں میں پھرتا ہی جہاں جاتا ہوں میں مجھکو حیرت ہے کہاں سی آئی تیری گھر کے پانو
میں سمجھتا عشق کی پایہ افزائی مری سر پہ پڑتے بعد مردن گر مری دلبر کے پانو

مصرعہ طرح

ان پر اُڑ اُڑ کر پڑی ہی کوچۂ جاناں کی خاک — اپنی آنکھوں سی لگاؤں آج نامہ بر کے پانو

ہی یہ رونا خود نہ چلدیں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ — پھیلتے جاتی ہیں بڈھب اتنو چشم تر کے پانو

سایۂ دولت بھی حسرت چلتی پھرتی چھانو ہی

کیا بنائی دست قدرت نے ہیں سیم و زر کی پانو

۲۷ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۳ھ

[illegible]

س ج ۹ طرح - مسلم یونیورسٹی — یہی ذری اُڑا لیجائینگے اک دن بیاباں کو

جوبلی ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۵ع

نئی ہر روز آفت ہی محبت میں مری جاں کو — دل آیا تو وہ کہتی ہیں نکالو دل سی ارماں کو

ضیا بخشی رُخ پُر نور نے صبح بہاراں کو — دل آرا کر دیا زلف معنبر نی شبستاں کو

کئی دیتی ہی وحشت پارہ پارہ کسوت ہستی — کہاں فرصت کہ بیٹھوں چاک کرنی میں گریباں کو

خلش بھر دی کچھ ایسی لذت افزا تیری چٹکی نی — کیا دل نی تصور نوک مژگاں نوک پیکاں کو

متاع دین و ایماں تو بچائی تو بچے یارب — وہ چشم فتنہ ساماں تاکتی ہی اتنو ایماں کو

بجا ہی گر کہیں یکجان دو قالب وادی وحشت — تری خار مغیلاں کو مری تار گریباں کو

قدم تیرا تو دم میرا یہی آباد رکھتی ہیں — شبستاں کو بیاباں کو چمن کو بیت احزاں کو

گئے وہ دن کہ اپنا آشیاں تھا صحنِ گلشن میں
قفس سے جھانک لیتے ہیں کبھی اب تو گلستاں کو

دلِ وحشی کو کیا تسکین ہو صحرا نوردی سے
اٹھا کر کوئی رکھدے گوشۂ دل میں بیاباں کو

جنوں کی نکتہ سنجی ناقۂ لیلیٰ کو غیبت تھی
بنایا میلِ سرمہ قیس نے خارِ مغیلاں کو

کبھی وہ زلف عنبر بو نشاطِ خواب راحت تھی
ترستی ہیں آنکھیں اب تو اک خوابِ پریشاں کو

معاذاللہ وہ ترکِ چشم جس کے ایک اشارہ نے
بنایا غازۂ روئے زمیں خونِ شہیداں کو

نمک ریزی سے راحت ہے دلِ مجروح کو حسرت
بنایا محرمِ رازِ نہاں ہم نے نمکداں کو

(مرثیہ - از بیاض ۱۳۰۳ھ)

کس نے وحشی بنا دیا مجھکو
کس نے صحرا جھنکا دیا مجھکو

کس کی فرقت نے کر دیا بیتاب
کس کے غم نے جلا دیا مجھکو

کون دنیا سے کر گیا رحلت
کون بیجاں بنا گیا مجھکو

ک کرے علاج جوشِ وحشت چارہ گر — لادے اک جنگل مجھے بازار سے (مومن دہلوی)

س نیا مضمون ہے۔ جناب جلیلؔ۔

کس کی صورت نظر نہیں آتی — کون غم میں ڈبا گیا مجھکو
کیسا صدمہ ہوا مجھے یارب — جس نے بے خود بنا دیا مجھکو
ہردم آنکھوں سے اشک ہیں جاری — کس کا جانا رُلا گیا مجھکو
بات منہ سے نہیں نکلتی ہے — دل ربا چپ لگا گیا مجھکو
دل کو آتا نہیں ذرا آرام — میرے اللہ کیا ہوا مجھکو
کس کا ماتم ہوا ہی جاں فرسا — کس نے بے جاں بنا دیا مجھکو
اپنا کیا حال دوستو لکھوں — غمِ دوری نے کھا لیا مجھکو

ردیف ہ

نعت

تمنا ہے تمنّائے مدینہ — تماشا ہے تماشائے مدینہ
مرے سر میں ہی سودائے مدینہ — مرے دل میں تمنائے مدینہ
بناؤں خاک اُس کی سرمۂ چشم — خدا دکھلائے صحرائے مدینہ

ہے اُس دل میں یقیناً نورِ ایماں ہو جس دل میں تولائے مدینہ
شرف ہے عرش پر اُس کی زمیں کو عجب ہے شان والائے مدینہ
سراسر ابرِ رحمت چھا رہا ہے ہے سایہ حق کا بالائے مدینہ
غلامی اپنی رشکِ سروری ہے مرا آقا ہے مولائے مدینہ
نثار اس سر پہ سو ہوش و خرد ہیں ذرا ہو جس میں سودائے مدینہ
تماشا گاہِ عبرت ہیں یہ آنکھیں نہ دیکھیں گر تماشائے مدینہ
جمال اُسمیں ہے کس کا جلوہ فرما ذرا دیکھو تو سیمائے مدینہ
قسم رب کی وہ پتھر سے ہے بدتر نہ ہو جس سر میں سودائے مدینہ

مرے دل میں یہ حسرت آرزو ہے
کہ دیکھوں میں تجلائے مدینہ

نشاطِ دل مدینہ ہے مدینہ　　بہارِ گل مدینہ ہے مدینہ
زمیں پر جلوہ گاہِ عرشِ اعظم　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
رسول اللہ کی ہجرت کا ماویٰ　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
بہارِ جاں فزا خُلدِ بریں کی　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
گنہگاروں کی امیدوں کا ماویٰ　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
تعالیٰ شانہ فردوسِ عالم　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
فلاحِ دین ودنیا کا سہارا　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
لبالب نورِ ایماں کا سمندر　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
دل وجاں سے زیادہ مجھکو پیارا　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
توانائی مرے ایمان ودیں کی　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
عروجِ حسن کا خورشید رخشاں[۵]　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
ہیں سارے اہل دل مفتونِ حسن ہم　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ

---

۵ "سپہرِ حسن کا ماہِ منور"

بساطِ دہر کا گلزارِ رعنا مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ

دل و جاں کا سرور و نورِ حسرتؔ

۲۶ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ

مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ

سعادت کا خزینہ ہے مدینہ کرامت کا نگینہ ہے مدینہ

ہے مدفن رحمۃ للعالمیں کا رسالت کا دفینہ ہے مدینہ

وفورِ نقدِ رحمت دیکھ جا کر خزینہ ہے خزینہ ہے مدینہ

کھڑا ہے دم بخودِ طوفانِ عصیاں سفینہ ہے سفینہ ہے مدینہ

ہے ایماں کی سند پر مُہر اُس کی نگینہ ہے نگینہ ہے مدینہ

جہاں کے سارے شہروں سے ہی بہتر بہینہ ہے بہینہ ہے مدینہ

دلِ مضطر وہاں پاتا ہے تسکیں سکینہ ہے سکینہ ہے مدینہ

میں اُس کے حُسن پر قربان حسرتؔ

حسینہ ہے حسینہ ہے مدینہ

ردیف یا

گئے تو نے دورِ آسماں کیسے کیسے — زمیں کو دکھائے سماں کیسے کیسے

اِدھر دل ہے مضطر اُدھر چشم حیراں — ہمارے بھی ہیں رازداں کیسے کیسے

اُٹھائے ہیں دیدارِ لیلیٰ کی خاطر — ستم غمزۂ ساربان کیسے کیسے

کدھر ہیں کیانی و رومی و مغلی — جہاں سے اُٹھے خانداں کیسے کیسے

بس اک حسرت آلودہ طرزِ نگہ میں — سخن کہہ گئے بے زباں کیسے کیسے

غضب ہے تری نیم بانہ آنکھ ظالم — ہزاروں گئے نیم جاں کیسے کیسے

عجب کیا کہ ہر ذرۂ خاک دل ہو — ملے خاک میں دلستاں کیسے کیسے

ذرا جھانک کھڑکی سے ظالم پڑے ہیں — ترے در پہ بے خانماں کیسے کیسے

حیا ناز پندار رغب و تغافل — تمھارے بھی ہیں پاسباں کیسے کیسے

کبھی ہو کے پانی بہا یہ نہ حسرت
ہوئے دل پہ جورِ بتاں کیسے کیسے

ربیع الاول ۱۳۰۰ھ

نہ تو دل ہے نہ ہے جگر باقی
ہے مگر شوقِ یک نظر باقی

دل لگی کو ہنسی سمجھتے ہو
ابھی بچپن کا ہے اثر باقی

تم کو لائے گی راہ پر اک دن
کششِ شوق ہے اگر باقی

ناوکِ دلگداز کیوں ہی اُداس
ابھی پہلو میں ہے جگر باقی

یاس پر کچھ تو عمر گذری ہے
کٹ رہے گی امید پر باقی

قبر پر شمع آہ روشن ہے
بجھ گئی آگ ہے شرر باقی

خونِ وصلِ عدو پہ رونا ہے
کچھ تو رہنے دے چشمِ تر باقی

چومتا ہوں خود اپنے لب حسرتؔ
کس کے بوسہ کا ہے اثر باقی

نورِ وحدت کا دل میں جلوہ ہے
میرا سینہ بھی طورِ سینا ہے

یادِ قامت میں حشر برپا ہے
کس قیامت کا سر میں سودا ہے

چاندنی رات ہے وہ مہوش ہے
اوج پر بخت کا ستارا ہے

شرم کے مارے جو نہیں لڑتیں
انھیں آنکھوں نے مجھکو مارا ہے

ہاتھ دل پر ہے دل ہے بے قابو
یہ اُن آنکھوں کا اک کرشما ہے

تیری فرقت میں جو گذرتی ہے
عالم الغیب خوب دانا ہے

ہار اُس حور کے گلے میں نہیں
بیچ میں ماہ، گرد ہالا ہے

چال مستانہ آنکھ متوالی
یہی ساقی یہی پیالا ہے

حسن پر ناز ہے اگر تمکو
اپنے دل پر مجھے بھی دعویٰ ہے

چین دل کو نہیں کسی پہلو
کس کی شوخی کا رنگ اُڑایا ہے

اس پریوش کا ہے عجب عالم
سر بسر شوخیوں کا پتلا ہے

ق

چال دیکھو تو جیسے بجلی ہے
شکل دیکھو تو اک بھبوکا ہے

آنسوؤں کو تو روتا ہے حسرت
ابھی کم بخت خون رونا ہے

(بر طرح اقبال مرحوم)

نشاط دل و نر سے لبریز اک عالم کی جھولی ہے
گرہ چین جبیں کی کس بُت مہوش نے کھولی ہے

یہاں کہتے ہیں مرنا زندہ جاوید ہونے کو
زمانے سے نرالی منزل جاناں کی بولی ہے

اشارہ صاف کرتی ہے کسی سینہ کی موزونی
کہ جنسِ حسن قدرت نے اسی کانٹے میں تولی ہے

مسلّم ساتھ ہے از بسکہ دامن اور چولی کا
کیا جب میں نے دامن چاک [illegible] ساتھ چولی ہے

شرابِ ناب کی جلوے نگاہِ ناز پر صدقے
ابھی سوتی سے آنکھ اُس فتنۂ دوراں نے کھولی ہے

متاعِ صبر کا نام و نشاں باقی نہیں چھوڑا
یہ دزدیدہ نگاہوں نے گرہ دل کی ٹٹولی ہے

قیامت ہے تری کس کس ادا سے دل بچے ظالم
جو آنکھیں شوخ و پُرفن ہیں تو صورت بھولی بھولی ہے

گلِ نغمہ تکلّم سے ترے دامن میں بلبل کے
تبسّم نے بھری پھولوں سے فصلِ گل کی جھولی ہے

حصولِ مدعا اب کوئی دن کی بات ہے حسرت
نگاہیں مل چکی ہیں گفتگو مطلب کی ہولی ہے

سلسلہ جدید ع ۱ (طرح)

(خواجہ آتش لکھنوی)

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس میں بو تیری
خوشا وہ دشت کہ ہو جس میں جستجو تیری

خموش[۵ے] ہے مگر اک عالم تکلّم ہے
لبوں[۵ے] پہ غنچہ کے گویا ہے گفتگو تیری

جگر بھی چاک ہوا دل بھی پارہ پارہ ہوا
لگی ہوئی ہے مگر دل سے آرزو تیری

۵ے اصلاح حافظ جلیل الحسن صاحب جلیل

مقابلِ رخِ زیبا نہ ہونا اے گل تر — کہیں نہ خاک میں ملجائے آبرو تیری

اسیرِ صحنِ گلستاں نہیں دل آرائی — شمیمِ لطف دل افزا ہے کو بکو تیری

طریقِ اہل نظر میں ہے منع یکسوئی — زبسکہ جلوہ فروزی ہے چار سو تیری

ہنوز دشتِ ختن نافہ زارِ عالم ہے — کبھی کھلی تھی ادھر زلفِ مشکبو تیری

فرشتۂ اجل آئے پری کی قالب میں — بوقتِ مرگ جو صورت ہو روبرو تیری

امیدِ لطف پہ حسرت ہی باغِ رضواں میں
سنا ہی جب سی کہ لطف و کرم ہے خو تیری

س ج ۶ (طرح) — کہنے دیتی نہیں کچھ منھ سی محبت تیری

(داغ ـ دہلوی) — لب پہ رہ جاتی ہی آ آ کے شکایت تیری

بسکہ ساری ہی رگ و پے میں محبت تیری — بار پاتی ہی نہیں دل میں شکایت تیری

جان جائے کہ رہے یاد تری دل میں رہے — دمِ آخر بھی لبوں پہ ہو حکایت تیری

تابِ نظارہ تو جب ہو کہ رہیں ہوش بجا — پھر کہاں ہوش جو ہو سامنے صورت تیری

وادیِ عشق تری خار پہ ہو گل قرباں — انس سی بڑھ کے مزا دیتی ہی وحشت تیری

ماہ و خورشید سے روشن ہے فقط روئے زمیں — نور افزائے دل و جاں ہے محبت تیری
ایک دفتر ہے شکایت کا کھلا ہے پایاں — اے دلِ تنگ قیامت کی ہے وسعت تیری
روسیاہ ہوں کہ گناہوں کی حقیقت کیا ہے — بڑھ کے کونین سے وسعت میں ہے رحمت تیری
دلِ بیتاب نے بدلے ہیں ہزاروں پہلو — نہ نکلنی تھی نہ نکلی کبھی حسرت تیری
ماہ و خورشید کے پھیر میں پڑتا نہ کبھی — دیکھ لیتا جو مہندس کہیں ہیئت تیری
تھا کبھی اوج پہ تو جاہ و جلالِ مسلم — ہے زبانوں پہ فقط اب تو حکایت تیری

ہے جھلک حسن خود آرا کی تری حیرت میں
رشکِ صد آئینہ حسرت ہے یہ صورت تیری

(از بیاض ۱۳۰۳ھ)

شعلہ بھڑکا ہے جو سینہ میں عشق کا — اُس کے اثر سے منہ میں ہیں چھالے پڑے ہوئے
پوچھے ہے حالِ زار مرا دیکھ وہ صنم — ہو کس جفا سرشت کے پالے پڑے ہوئے
جلوے دیکھے جو اس کی قامت کے — ہوش جاتے رہے قیامت کے
ہائے وا آمق تیری دل کی حسرتیں نکلیں نہ کچھ — میرے ہمدم قبر میں مجھکو لٹا کہنے لگے

ناصحا کیوں کروں علاجِ زخم — کیا نشانی نہیں ہے یہ اُس کی

میری صورت جس نے دیکھی اُس نے فوراً رو دیا — دوستو حالت مری رونے کے قابل رہ گئی

(۹ محرم الحرام ۱۳۴۰ھ - بر طرح پیامِ یار — "حسرت برس رہی ہے یہ کس کا مزار ہے")

کس لالہ رو کے عشق سے دل داغدار ہے — حسرت سے جس کے سینہ گلشن میں خار ہے

عبرت فزا مقام ہے دنیائے بے ثبات — کل جو محل تھا آج اسی میں مزار ہے

سینہ مرا نمونہ گلخن ہے سوز سے — دلبر کا غم ہے دل میں مرے یا شرار ہے

کیسی چلی چمن میں یہ بادِ سموم آہ — یارب کہ دو ہی دن میں نہ گل نہ بہار ہے

ممکن نہیں کہ رازِ محبت چھپا رہے — چہرہ اُتر رہا ہے تو دل بیقرار ہے

رخِ جاناں گلاب کی پتی — ہے ہر اک ایک گل کھلائے ہوئے

ہم نہ بیمار ہیں نہ ہیں مجنوں — حضرتِ دل کے ہیں ستائے ہوئے

داستانِ الم کو یوں ٹالا — کہ یہ قصے ہیں سب سنائے ہوئے

ستم ہے آنکھ شوخ پُر جفا کی — جدھر دیکھا اُدھر آفت بپا کی

یہ کس کی تاب دل تجھ سے بچائے — غضب کی آنکھ ہے چتون بلا کی

ایک نشتر دل کے پتین بنائے ہوئے

جمایا رنگ دستِ شوخ میں ہے — یہ شوخی دیکھیے رنگِ حنا کی
نہ کی تسکین وعدہ سے بھی میری — ستمگر کوئی حد بھی ہے جفا کی
لے آیا گھر میں میرے دل رُبا کو — کشش تو دیکھئے جذبِ رسا کی
پھروں ہوں دل کو پکڑے مضطرب سا — پھری ہے آنکھ جب سے بیوفا کی
لئے پھرتے ہیں ہاتھوں ہاتھ گلرو — یہ قسمت دیکھیے برگِ حنا کی

اُٹھائے جور از بس اس کے واثق
طبیعت ہوگئی عادی جفا کی

حسرت نامہ

۱ القاب

اے مری جانِ بلکہ جانِ جہاں — جانِ شیریں و رشکِ نورِ جہاں
تجھ سے زینت ہے بزمِ عصمت کی — تجھ سے رونق ہے دل کی خلوت کی
تیری آنکھوں میں جان کے جلوے — جن پہ قرباں جہان کے جلوے

غیرتِ غنچہ تیرا تنگ دہن | پھول جھڑتے ہیں جس سے وقتِ سخن
دونو لب وہ نسیم کی موجیں | دل کو جنبش سے جو شگفتہ کریں
ہائے تیرا خرام مستانہ | دلِ ہشیار جس کا دیوانہ
تجھ کو اللہ شادماں رکھے | بامُراد اور کامراں رکھے
روز و شب عیش و شادمانی ہو | دلِ شیدا کی قدردانی ہو
شوقِ بیحد ہے شرح کیا لکھوں | یہی بہتر ہے مدعا لکھوں

۲ مدعا

دلِ مضطر کا حالِ زار کہوں | ستمِ ہجر و انتظار کہوں

۳ شبِ وصل

یاد آتی ہیں وصل کی راتیں | اور ناز و نیاز کی باتیں
تیرا ہر بار وہ بگڑ جانا | اور منانا وہ اپنا گھڑیوں کا
باندھنا پہنچیاں وہ پھولوں کی | گوری گوری کلائیوں پہ تری
عرق آلودہ چہرے کی وہ دمک | اور عطرِ عروس کی وہ مہک

گرم فقروں پہ سر جھکا لینا — دونوں ہاتھوں سے منھ چھپا لینا
بیٹھے بیٹھے وہ نیند کے فقرے — لینا انگڑائی آنکھیں مل مل کے
بھینی بھینی جوہی کی وہ خوشبو — وہ چنبیلی کی نگہتِ دلجو

۴ (صبح وصل)

صبح کے وقت کا نرالا سماں — حسن کا سب لٹا ہوا ساماں
آنکھوں میں سرمہ کا یونہیں سا اثر — بال بکھرے ہوئے وہ ماتھے پر
خواب نوشیں کی آنکھوں میں سرخی — کچھ کھلی کچھ بندھی ہوئی چوٹی
باسی پھولوں پہ اک اوداسی سی — اور بو اُن کی بگڑی بگڑی سی

۵ (یادِ ایام)

کیا ہوئیں وہ سرور کی راتیں — دیدہ افروز نور کی راتیں
تم پہ رحمت ہو وصل کے ایام — تم سے پھر مل کے خوش ہو یہ ناکام
جلد کیسے گزر گئے وہ دن — ادھر آئے اُدھر گئے وہ دن

۶ (صبحِ رخصت)

کیسی دلگیر صبحِ رخصت تھی — صبحِ رخصت کہ شامِ غربت تھی
گلے ملتی تھیں آرزوئیں باہم — دل کو تاراج کر رہا تھا غم
غم کی آمد خوشی کی رُخصت تھی — اک تمنّا ہزار حسرت تھی
تیرا ہنسکر وہ پان کا لینا — اپنے منہ کی الائچی دینا

۷ (رخصت)

تیرا جانا بلا کا آنا تھا — کیا قیامت کا تیرا جانا تھا
ایک سکتہ کا مجھ پہ تھا عالم — آرزوؤں کا دل میں تھا ماتم
دل پہ اک بیخودی سی تھی طاری — تھیں جنوں کی علامتیں ساری
ہر طرف بے کسی برستی تھی — بیکسی پر بھی بیکسی سی تھی

۸ (ہجر)

اب عجب حال ہے طبیعت کا — دل کسی چیز میں نہیں لگتا
جان پر اضطراب طاری ہے — بیقراری سی بیقراری ہے

پچھلی حالت جو یاد آتی ہے　　فرطِ وحشت سے جان جاتی ہے
دل ہے بیچین مضطرب ہے جگر　　مجھکو اُس کی خبر نہ اِس کی خبر

دُعا

اے خدا پھر ہو وہ زمانہ نصیب　　وصلِ محبوب سے ہو شاد حبیب
میرے گھر میں پھر آئیں اُسکے قدم　　جس سے بنجائے پھر وہ رشکِ ارم
ہو وہ عیش و نشاط کا چرچا　　نام باقی رہے نہ کلفت کا
فکر آئے تو اس سے کہدے سرور　　ٹھیر د باہر کہ عیش میں ہیں حضور
اے خدا یہ دعا ہو میری قبول　　بطفیلِ نبی و جاہِ بتول

(۶ ربیع الاوّل ۱۳۱۱ھ)

(چاندنی رات) برائے رسالہ مخزن لاہور

چاندنی رات! تیرا کیا کہنا　　تو نے پہنا ہے نور کا گہنا
چاند سے چار چاند تجھکو لگے　　منھ تری ضو سے فق ہیں تاروں کا
رخِ روشن کا تیرے وہ جلوا　　ماند جھومر پڑا ثریّا کا

بزمِ عالم ہے تجھ سے نورانی	پھر گیا دن کی آب پر پانی
تجھ سے عالم میں نور ہے ہر سو	تیرے دم سے سرور ہے ہر سو
قصرِ گردوں میں روشنی تجھ سے	فرشِ خاکی پہ چاندنی تجھ سے
چشمِ عالم کا تو اُجالا ہے	عیش کا تجھ سے بول بالا ہے
پاسبانی کا تیرے وہ شہرا	پانو پھیلا کے سوتی ہے دنیا
کیوں ہو تو روشن و خنک ایسی	چشمۂ نور سے ہے کیسا نکلی
ہو مقابل اگر ضیا تیری	قلعی کھل جائے سنگِ مرمر کی
تجھ سے شہروں میں رونقِ تازہ	چاندنی چوک ہر گلی کوچہ
موجزن ہے جو نور کا دریا	بقعۂ نور بن گیا صحرا
نور کی آبشار ہے جاری	بھر گئی آب سے زمیں ساری
چاندنی ہے یہ دشت میں پھیلی	یا کہ چاندی کی بہتی ہے ندّی
کیے دیتی ہے قلب کو مخمور	چاندنی ہے کہ ہے شرابِ طہور
جلوۂ باغ ہے عجب دلکش	چاندنی کی بہار پر دل غش

نور سے چھلکا حوض کا ساغر — چادرِ آب نور کی چادر
شاہدِ گل پہ ہے عجب جوبن — نور کا ہے گلے میں پیراہن
جلوہ گر حسن اس کا ہو کم کم — اُس کے محجوب ادا کا یہ عالم
خوابِ نوشیں میں ہو کوئی دلبر — ق — آنچل آبِ رواں کا ہو منہ پر
ہے یہ نقشہ سپید ایواں کا — موجزن جوئے شیر ہے گویا
در و دیوار ہیں سراپا نور — جن سے شرمائیں آنکھیں موتی چور
بالا خانے پہ ہے عجب جلوا — حسن بالائے حسن صلِّ علیٰ
اک پلنگڑی پڑی ہو نازک سی — چادر اس پر کسی ہوئی اُجلی
پتلے پتلے ہیں مخملی تکئے — پھول رکھے ہوئے چنبیلی کے
خوابِ راحت میں ایک مہوش ہو — جسکے جوبن پہ چاندنی غش ہے
رنگ پوشاک کا ہو کافوری — روحِ خس شاد بو سے ہو جس کی
چہرہ پر اک ادا قیامت کی — لبِ نازک پہ مسکراہٹ سی
کچھ پسینے سے نم ہے پیشانی — عکس مہتاب سے ہو نورانی

ہے تموج میں نور کا چشمہ | یا ابھرتا ہے سانس سے سینہ
ذرا نیچے کو جھک گیا ہے سر | ہاتھ رکھا ہے ایک تکیہ پر
دوسرا ہاتھ اُس کا سینہ پر | پہرا بیٹھا ہوا خزینہ پر

(برسات)

اے قدرت حق کی شان برسات | اے جوشِ نمو کی کان برسات
رحمت کا سماں دکھانے والی | صحرا کو چمن بنانے والی
دنیا ترے دم سے شاد و شاداب | عالم ترے دم سے سیر و سیراب
بازاروں میں سب ترا کرشمہ | صنعت کی کلوں میں تیرا جلوا
راجوں کے ہیں راج تیرے دم سے | شاہوں کے مزاج تیرے دم سے
دہقانوں کے دل کی آس تو ہے | تو ان کی امید و آرزو ہے
تپ تپ کے ہوئی زمین بنجر | سبزے کا نہ تھا نشان جس پر
لُو نے تھا اُسے کچھ ایسا جھلسا | ہوتا تھا نظر کو جس سے صدما
وحشت سے بھرا تھا ایسا صحرا | جیسے خفقانیوں کا چہرا

ہے آج زمیں جو رشکِ گلشن   کل تخم کے واسطے تھی گلخن
اشجار ہوئے تھے ساری بدروپ   پتّوں کو جلائے دیتی تھی دھوپ
گرمی کا ہوا میں تھا یہ غلبا   دشوار ہوا تھا سانس لینا
حدت سے رُکی جو سانس اُن کی   کتّوں کی زبان منہ سے نکلی
چلتی تھی سموم کس غضب کی   توبہ توبہ پناہ رب کی
شدّت کی لو کنار دریا   پانی میں خواصِ نار پیدا
گرمی سے اُبل اُٹھے جو تالاب   ماہی ہوئی پانی میں بھی بے آب
پانی کو تھی زمیں ترستی   اور آگ فلک سے تھی برستی
انسانوں کی جان پر بنی تھی   گرمی کہ عذاب جانکنی تھی
ہاتھوں میں تھے پنکھے لب پہ خشکی   آنکھوں میں جلن تھی دل پہ گرمی
پانی تھا خنک ہر اک کو مطلوب   بازار تھا گرم برف کا خوب
موسم میں ہوا ہے کچھ تبدل   بنیادِ تپش میں ہے تزلزل
مغرب سے پھری ہوئی ہوا ہے   پانی کا مزا بدل چلا ہے

بیکار ہیں جھجّر اور صراحی — ہوتا نہیں سرد اُن میں پانی
بے لطف ہوئی ہے خس کی ٹٹی — باقی ہی نہیں ہے اس میں سردی
ٹکڑے بادل کے کالے کالے — گردوں پہ اِدھر اُدھر ہیں بکھرے
دیتے ہیں خبر جہاز آکر — ہے جوش و خروش میں سمندر
ساحل کی طرف ہے یار آتا — بارش کی اُمید ہے دلاتا
طوفان پہ ہے خلیج بنگال — کیسا ہے جہازوں کا بُرا حال
اک بار ہوا کا رنگ بدلا — بدلی جو ہوا تو اَبر آیا
پورب سے گھٹائیں کالی کالی — سرسبز زمیں کو کرنے والی
مخلوق کو چین دینے والی — مستوں کی دعائیں لینے والی
مستانہ اُٹھیں بڑھیں اُمنڈ کر — آفاق پہ چھا گئیں سراسر
دل کھول کے بحر و بر پہ برسیں — دم بھر میں تمام جھیلیں بھردیں
بارش کا جو تار لگ گیا تھا — رحمت کے پیام لا رہا تھا
قطرے جو زمیں پہ ٹوٹتے تھے — فوارے کروڑوں چھوٹتے تھے

مخلوق کے دل کو چین آیا — خوش ہے ہر ایک پیر و برنا
اطفال بہم نہا رہے ہیں — پانی کی خوشی منا رہے ہیں
رحمت کا نزول ہو چکا ہے — سرشار ہر اک شجر کھڑا ہے
ہر شاخ نہا نہا کے نکھری — قدرت نے کئے نثار موتی
ہر پھول سے رنگ ہے ٹپکتا — ہر برگ سے زندگی ہویدا
آواز پپیہا دے رہا ہے — خاموش سا ہر شجر کھڑا ہے
عشاق کا دل ہے محوِ تاثیر — سنّاٹے ہیں دشت مثلِ تصویر
فریاد میں دردِ دل نہاں ہے — مفہوم فغاں سے "پی کہاں" ہے
اس زور سے چیختا ہے پیہم — رہ جاتا ہے چپ وہ ہو کے بیدم
کویل وہ نظیرِ قیس و لیلیٰ — جاں سوختہ سانولی سلونی
پر سوز و گداز اُس کی آواز — مہجوروں کے دردِ دل کی ہمراز
گلزار ہیں باغ اِس کے دم سے — پُر کیف دماغ اس کے دم سے
چوپایوں کے صاف ستھرے گلّے — رمنوں میں اِدھر اُدھر ہیں چرتے

سبزے میں سپید اور کالے
بھاتے ہیں نگاہ کو وہ کیسے

ہے پُل پہ عجیب لطف دیکھو
منھ جانبِ غرب کر کے بیٹھو

سورج ہے غروب ہوتا جاتا
عالم پہ سکوت سا ہے چھایا

موجوں سے نسیم کھیلتی ہے
ٹھکراتی ہے اور ڈھکیلتی ہے

پانی کی بچھی ہوئی ہے چادر
مقیش بکھر رہا ہے اُس پر

گردوں پہ ہیں رنگ کیسے کیسے
پھیکے اور شوخ بھاری ہلکے

ہر رنگ میں اک نئی ادا ہے
گلزار فلک پہ کھل رہا ہے

پانی جو افق سے جا ملا ہے
نظارہ عجیب ہو رہا ہے

اک غمزدہ اک طرف ہے بیٹھا
حیرت سے بنا ہوا تماشا

خاطر میں خیال ہے کسی کا
نظروں میں جمال ہے کسی کا

فرقت کی ہے چوٹ اس کے دل پر
آنکھوں کو تلاشِ روئے دلبر

بیتاب ہے سوزشِ دروں سے
بے چین ہے شورشِ جنوں سے

حسرت سے بھری ہوئی نگاہیں
سینہ میں گھُٹی ہوئی ہیں آہیں

یہ شعر ہے اس کے لب پہ آتا   مطلوب کو جب نہیں ہے پاتا

جو ُگل وُمُل خوش ست لیکن

بے روئے نگار خوش نباشد

تصویرِ عبرت

(یعنی)

نورجہاں کا مقبرہ

بزم اک لاہور میں ہے خادمانِ قوم کی   جنکے دل سے لگ رہی ہے فکر شانِ قوم کی

حسرتِ بیدل بھی اب کے شاملِ محفل ہوا   رنگِ محفل سے سرورِ بیکراں حاصل ہوا

بلبلانِ قوم کے جب چہچہے سب سن لئے   شہر خاموشاں میں جا نکلا میں عبرت کیلئے

پھرتے پھرتے مرقدِ نورجہاں آیا نظر   مقبرہ تھا وہ کہ تھا تصویرِ عبرت سربسر

کل تھا جسکی شان پر عالم کا دل آیا ہوا   آج عالم بیکسی کا اُس پہ ہے چھایا ہوا

جسکے رتھ کو ہانکتا تھا بادشاہِ روزگار   گردشِ گردوں سے یوں تاراج ہو اُسکا مزار

چوٹ سی دل پر لگی اُجڑی وہ حالت دیکھکر — جان ہی پر آبنی بگڑی وہ صورت دیکھکر
دل کی آنکھیں کھل گئیں غفلت کا پردہ اُٹھ گیا — بیخودی نے مجھکو دکھلایا تماشا اک نیا
شکل اک آئی نظر استادہ با فرِ شہی — جو عجب حسرت سے روضہ کی طرف تھی دیکھتی
اسکی پیشانی سے رعبِ سلطنت تھا جلوہ گر — اسکی چتون سے برستا تھا غضب کا کروفر
(دل نے آہستہ کہا یہ ہی جہانگیرِ غیور — مقبرہ میں سونیوالی اسکے دل کی تھی سرور)
دیر تک تو ضبط بیتابیٔ دل کرتی رہی — جوش بیتابی سے وہ مجبور آخر ہوگئی
آہ کھینچی ایک اُس نے بادلِ اندوہ گیں — یوں کیا اظہارِ دردِ دل بآوازِ حزیں
کیا اُسی بیگم کا ہے یہ خوار وخستہ مقبرہ — برسوں ڈنکا جس کا ملک ہند میں بجتا رہا
میں نے جسکے سر پہ قرباں چترِ شاہی کردیا — جسکی جوتی کے تلے اورنگِ شاہی دھر دیا
جسکے قدموں پر فدا کردی تھی میں نے سلطنت — جسکے آگے سر جھکا دیتے تھے اہلِ تمکنت
جسکی صورت جلوۂ فردوس کی تصویر تھی — جس کی رنگینی بہارِ خطۂ کشمیر تھی
آہ وہ ایامِ عشرت اور وہ لیل و نہار — بلبلِ آمل چہکتا دیکھ کر جن کی بہار
جسکی رنگین بزم رشکِ روضۂ فردوس تھی — بیکسی سے اسکے روضہ کی ہو کیا صورت بنی

ملک الشعرا طالب آملی

ظالموں نے قبر کا تعویذ تک چھوڑا نہیں | کونسا گوشہ ہے تربت کا کہ جو توڑا نہیں

بذلہ سنجی سے خجل ہوتی تھی جس کی پھلجھڑی | حیف وہ خاموش آغوشِ لحد میں ہے پڑی

قصر میں بچھتا تھا جسکے فرش دیبا و حریر | آہ فرشِ خاک پر سوتی ہے وہ ماہِ منیر

جھمگھٹے میں نازنینوں کے جو کرتی تھی بسر | آہ اُسکی قبر پر اب بیکسی ہے نوحہ گر

سیج پر پھولوں کی سوتی تھی کبھی جو نازنیں | پھول دو سوکھے بھی اسکی قبر پر چڑھتے نہیں

جسکی پابوسی کی کرتے آرزو گلہائے تر | خشک کانٹوں[۱] کا پڑا ہے ڈھیر اُسکی گور پر

حسن جس کا نازگیِ بخشِ گل و گلزار تھا | آہ قسمت میں لکھا اُسکی لحد کے خار تھا

قصر میں جلتی تھی جسکی شمعہائے عنبریں | حیف روشن اک دِیا بھی قبر پر اسکی نہیں

نام روشن ہے جہاں میں آہ جس کا سربسر | نام کو بھی روشنی آئے نہ اُس کی قبر پر

کر دیئے جس نے بہت سے صاحبِ طبل و نشاں | اس شکستہ مقبرہ میں وہ پڑی ہے بے نشاں

جسنے صدہا خلعت دیبا و اطلس دیدیئے | حیف ترسے اسکی تربت ایک چادر کے لئے

لونڈیوں پر جسکی تھی پوشاک گلزار بفت کی | آج دیواریں ہیں اُسکے روضہ کی ننگی کھڑی

۱ جب راقم نے فاتحہ پڑھی تو نور جہاں کی قبر پر کانٹوں کا انبار پڑا ہوا تھا۔ (شرردانی)

یہ کہا اور ہو گئی چپ ایک لمحے کے لئے   پھر ادا اک شانِ استغنا سے یہ جملے کہے

کیا ہوا گر ظالموں نے توڑ ڈالی قبر تک

روشن اس کا نام دنیا میں رہے گا حشر تک

مطالعہ سے پہلے تصحیح فرمالیجئے

حصۂ نثر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۹	سمائی	پیمائی
″	۱۴	کاروانِ حسرت	صاحبِ "کاروان حسرت"
۵	۱۷	زنبیلِ خیال	کاروان حسرت
۹	۸	جائدائیں	جائدادیں
۴	۱۲	ڈٹر	ڈنٹر
		(حصۂ نظم)	
۱۷	۸	متقبت	منقبت
۲۵	۹	رعب	رعب
۲۶	۹	بوسر	بوسے
۲۸	۸	کفت گو	گفتگو
۲۹	۱۲	حو	جو
″	۱۳	ہو	تو
۴۷	۱	سکھے	سکے

اَلثَّوْرَۃُ الْہِنْدِیَّہ

اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کے ایک باغی مجاہد علامہ فضل حق خیر آبادی نے ہندستان کی پہلی جنگ آزادی اور اپنی عمر قید کالے پانی کے حالات لکھے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کتنا حصّہ رہا ہے اور مسلّط وحاکم قوم (انگریز) نے ان پر کیا کیا ستم روا رکھے ہیں۔ اس کا ترجمہ مولانا عبد الشاہد خاں شروانی نے نہایت سلیس اُردو میں کیا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ اصل عبارت بھی درج ہے شروع میں باغی مجاہد کی سوانح حیات بھی ہے۔ "باغی ہندوستان" کی سب سے بڑی خصوصیّت یہ ہے کہ امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد نے اس کا تعارف کرایا ہے اور اس باغی مجاہد کے ایک مکتوب گرامی مورخہ ۱۲۷۲ھ کا عکسی بلاک اور ضبط شدہ محل سرا کے دروازے کے اندرونی و بیرونی منظر کا فوٹو بھی دیا گیا ہے۔ صفحات (۵۰۰) قیمت مجلد پانچ روپے (۵ر)

کاروانِ خیال

مولانا ابو الکلام آزاد کے تازہ خطوط کا گرانقدر مجموعہ

ملک کو قلعہ احمد نگر کی اسیری سے رہائی کے بعد مولانا ابو الکلام آزاد کے دوسرے مجموعہ خطوط کی اشاعت کا شدید انتظار تھا۔ ان خطوط کا دوسرا صحیفہ "کاروان خیال" ہے جس میں اسلامی ہند کے دو صدر نشین بزرگوں مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا حبیب الرحمن صدر یار جنگ بہادر کی چھ سالہ خط و کتابت درج ہے شروع میں دونوں بزرگوں کی زندگی کے نمایاں واقعات پر ایک مقدمہ قلمبند کیا گیا ہے کاروان خیال میں علم حکمت، ادب، تاریخ کے وہ خزانے موجود ہیں جن کی ہمیں مدت سے تلاش تھی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ (۲؍۸)

ملنے کا پتہ

ادارہ علمیہ، محمد علی روڈ، علیگڈھ